ماہنامہ
مئی 2024ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اسی واں سال
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

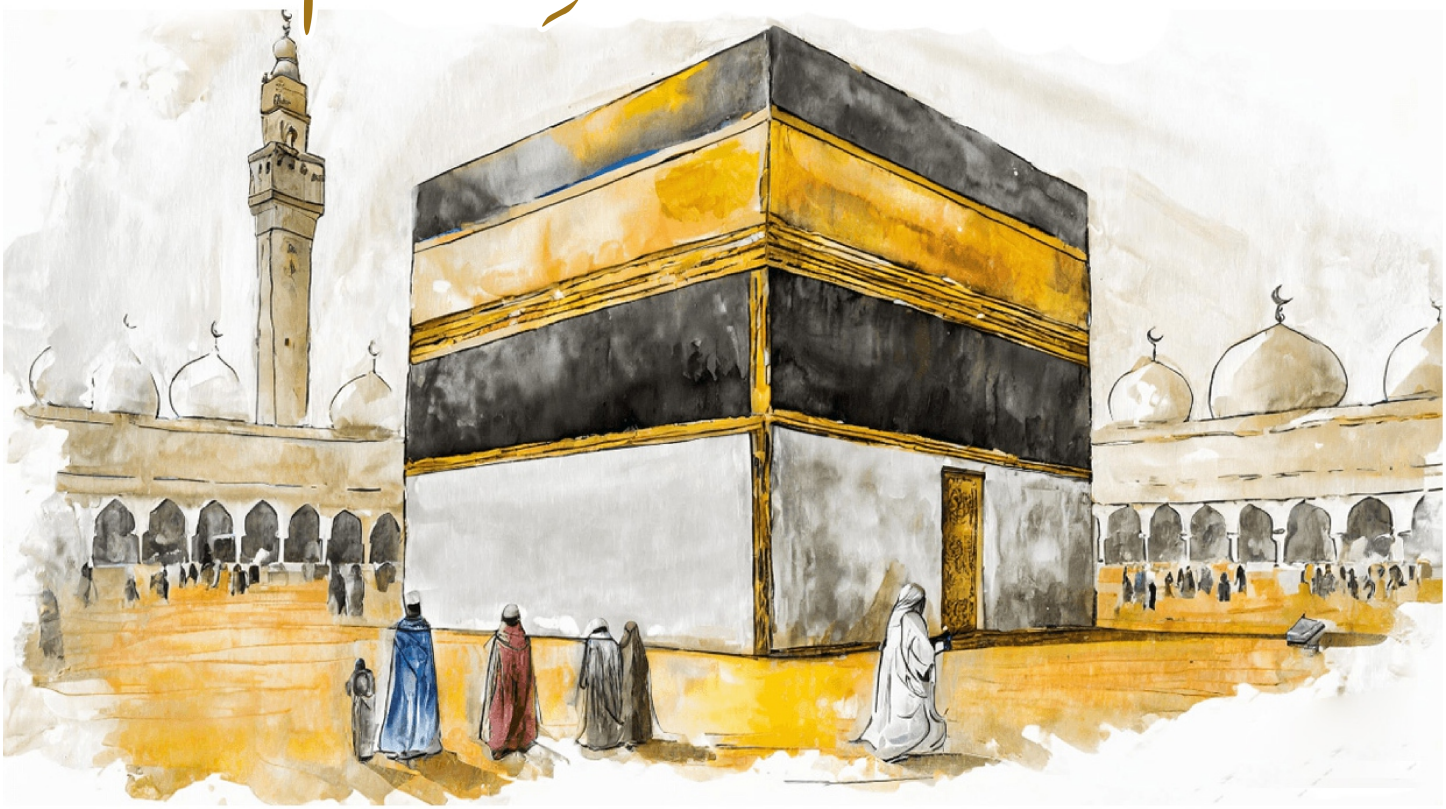
لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾ (3:96)

اُمتِ مسلمہ کا اجتماعِ عظیم



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الإِسْلَامُ (3:19)۔

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوع انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 65 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
جون 2024ء

جلد 77 | شمارہ نمبر 6

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: عیدالاضحیٰ	ادارہ	4
جنرل کونسل کے اجلاس میں چیئرمین ادارہ خورشید انور صاحب کی اختتامی گفتگو	ادارہ	8
دوقومی نظریہ (اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی نگاہوں میں)	علامہ پرویز علیہ الرحمۃ	14
حلال وحرام درسِ قرآن (سورۃ النساء آیات 160 سے 161 تک)	علامہ پرویز علیہ الرحمۃ	36
علامہ غلام احمد پرویزؒ اور موجودہ سکالر	آصف جلیل، لاہور	57
''عورت قرآن کے آئینے میں'' پر ایک طالب علم بیٹی کا تبصرہ	نفیسہ فریاد چاہل	61

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عید الاضحیٰ

پرویز علیہ الرحمۃ کی وہ تقریر جو نشرگاہِ دہلی سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی۔ (طلوع اسلام)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے، لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت، ایک خاص ترتیب سے، ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ، محسوس شکل میں، گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل، بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ اپنی بین المللی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (3:96) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں

کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی، جاپانی، ہندی، افغانی، ایرانی، تورانی، حبشی، افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے' وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے' اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک حاکم کے محکوم' ایک قانون کے تابع' ایک نظام کے پابند' فقیرانہ لباس' ننگے سر' گدایانہ وضع' قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز' مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفورِ شوق سے بے قرار' آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لبیك اللهم لبیك کہتے ہوئے یوں رواں دواں' جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں' رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ' تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکھٹا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ (6:162-163) میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے' وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد' پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے' کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی

پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم، آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو، لب پر دعائیں، محویت کا عالم، آسمان سے نور کی بارش، رحمتوں کا نزول، غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلیٰ پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں، 9 تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے' اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ' اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں' التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ (22:37) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگیٔ مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں' دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (2:198) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)

تا کہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن و عافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ''هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ'' تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو ''قِيٰمًا لِّلنَّاسِ'' تمام نوع انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے' دنیا کا امن و سکون۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹی جس کی عمر 22 سال تقریباً قد 5 فٹ 3 انچ' زیر تعلیم نرسنگ شیخ زید ہسپتال لاہور چوتھے سال میں' کے لئے موزوں ہم پلہ رشتہ درکار ہے۔ خواہشمند درجِ ذیل نمبر پر براہِ راست رابطہ کر سکتے ہیں:

رابطہ نمبر: 0300-6766863

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنرل کونسل کے اجلاس میں
چیئرمین ادارہ خورشید انور صاحب کی اختتامی گفتگو

جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ 21 اپریل 2024ء میں چیئرمین ادارہ خورشید انور صاحب کی اختتامی گفتگو کچھ احباب کی خواہش پر (تحریر اور تقریر کے مختلف تقاضوں کے پیشِ نظر الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ) پیش خدمت ہے:

میں ایک بار پھر آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی طرف سے جو تجاویز اور آراء آئی ہیں انشاءاللہ تعالیٰ ان کی روشنی میں، ہم اپنا آئندہ کا پروگرام بنائیں گے۔ یہاں پر ہمارے معزز مبصر جناب وسیم رشید صاحب نے نوجوانوں کی عدم شمولیت کے سلسلے میں جو بات کی تو یہ میری نظر میں بہت وزنی بات ہے کیونکہ جب میں اس بات پر سوچتا ہوں، کہ ہماری بزموں میں شرکاء کی تعداد کیوں کم ہو رہی ہے، ہماری بزمیں کیوں ختم ہو رہی ہیں ہم آگے کیوں نہیں بڑھ پا رہے تو اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جس کی طرف شاید ہماری نگاہ نہیں گئی ہو۔ مگر اس کی ایک وجہ ہماری اپنی کوتاہیاں بھی ہیں کہ ہم اپنے بچوں کے لیے، اعلیٰ سکولوں کی طرف تو دیکھتے ہیں، ان کے مستقبل کے لئے، ان کی تربیت کے لئے، ان کی ٹیکنیکل تعلیم کے لئے، یعنی ان کی مادی ضروریات اور مستقبل کے لئے تو ہم سب کچھ کرتے ہیں مگر ہم میں سے شائد کسی نے اپنے بچوں کو ابھی تک یہ دعوت نہیں دی، کہ میں جو یہاں تک پہنچا ہوں، تو میں نے حقیقت کی تلاش میں بہت سارے مکاتب فکر کے لٹریچر کا مطالعہ کر کے ان کے نظریات کو پرکھا ہے۔ اگر ان کو یہ بھی بتائیں کہ ان سب میں مجھے کیا فرق نظر آیا۔ کونسا پروگرام قرآن خالص پر مبنی ہے اور کونسا نہیں ہے۔ انسان کا مستقبل، اس کی دنیا اور آخرت سب اس سے وابستہ ہیں۔ آپ خود بھی تحقیق کر لیں۔ ان تعلیمات کا بھی تنقیدی نظر سے مطالعہ کریں، دوسرے مکاتب فکر کے لٹریچر سے اس کا موازنہ کریں، اور پھر سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کریں۔، کیونکہ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی نہیں ہے آخرت کی بھی ہے۔ موت کے ساتھ زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ یہ موت کے بعد بھی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے چلتی ہے۔

اس طرح ہم نے نوجوان نسل کو قرآن فہمی کی طرف راغب کرنا ہے۔ یہ کام اپنے بچوں سے اس لئے شروع کرنا چاہیے کہ قرآن کریم کا یہی فرمان ہے کہ سب سے پہلے آپ کے جو قریبی لوگ ہیں ان کو آگاہ کریں:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (سورۃ الشعراء، آیت:214)

سب سے پہلے آپ کے جو قریبی لوگ ہیں ان کو آگاہ کریں۔

اس لئے ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو کم از کم یہ پیغام پہنچائیں، مگر ہم نے اپنے بچوں سے بھی اس پیغام کو چھپایا ہوا ہے دوسرے لوگوں کو پہنچانا تو دور کی بات۔ آپ دیکھ لیں کہ ہمارا یہ پروگرام اس لیے آگے نہیں بڑھ رہا کہ ہمارے ساتھ ہمارے بچے شامل نہیں ہیں۔ میں آپ کو اپنی مثال اگر دوں تو میرے ساتھ میرے بچے بھی اس تحریک کی تمام سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ ان کی قرآنی فکر سے وابستگی میرے احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اپنے مطالعے کے بعد یہ ان کے دل کی آواز بن چکی ہے۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ ان کو دعوت فکر دی ہے۔ میرے لئے زیادہ تر کام جو ٹیکنالوجی کی مد میں ہو یا سوشل میڈیا کا ہو، اس میں میرے بچے میرا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔

سوات میں ابھی جو ہم نے بابا جی کے یوم وفات کے حوالے سے پروگرام منعقد کیا تھا آپ نے اس کی ویڈیو کلپس بھی دیکھی ہوں گی، ان کی ریکارڈنگ اور ویڈیوز بنانے کا کام میرے نواسے نے کیا تھا۔ میرے بیٹے بھی ساتھ تھے۔ میرا بیٹا عمران، اور ان کا ایک اور ساتھی دلدار یوسفزئی، علامہ پرویز صاحب کے دروس القرآن کی تلخیص جو راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے محمد اکبر ڈکشٹ بھاردواج صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس سے پشتو میں آڈیو بک بنا رہے ہیں اور ہم یوٹیوب چینل پر اسے شیئر کرتے رہتے ہیں۔ پشتون بیلٹ میں ان کو خوب پزیرائی مل رہی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کو اس مشن میں شامل کریں گے۔ تو بہترین نتائج نکلیں گے۔

اگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فکر صحیح ہے تو سب سے پہلے جن سے ہمیں محبت ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کی موجودہ اور آئندہ زندگی بہتر ہو تو پھر ان سے ہم غفلت کیوں برتتے ہیں؟ ان کو ابھی تک ہم نے اپنے ساتھ شامل کیوں نہیں کیا؟ یہ بزرگ جو اکیلے آرہے ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بچے قرآنی فکر سے بے خبر ہیں۔

اس میں ہماری اپنی ہی خامیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ ہم نے وہ کردار ادا نہیں کیا جو ادا کرنا چاہئے تھا۔ ہم نے اپنے بچوں کو دوستوں کی طرح ساتھ نہیں رکھا۔ ہم نے انہیں یہ نہیں سمجھایا کہ ہمیں بلا جھجک بتائیں، کہ ہمارے کس کس عمل سے آپ خوش نہیں ہیں یا آپ کو غلط لگ رہا ہے۔ کیونکہ اپنی غلطیاں انسان خود محسوس نہیں کرتا۔ اگر کوئی غیر آپ کو سمجھائیں گے تو شاید آپ کو برا لگے۔ لیکن اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی نشاندہی کرے، تو شاید برا نہ لگے، کیونکہ وہ سب سے زیادہ آپ سے محبت بھی رکھتے ہیں اور عزت بھی کرتے ہیں۔ تو آپ خود ہی سوچیں گے کہ ہاں یہ کمی یا غلطی ہے اس لئے میرا بیٹا، بیٹی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس لئے آپ ضرور اپنی اصلاح کرینگے۔ لہٰذا ہمیں اس بات پر توجہ دے کر سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں پر بھی توجہ دیں اور ان کو بھی اس طرف راغب کریں۔

اور دوسرا یہ جو ہماری تحریک آگے نہیں بڑھ رہی، جس کا ذکر میں نے تھوڑی دیر پہلے کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہم

نے دستور اساسی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ میں چیئرمین ہوں یا ادارہ ہے یا ہماری بزمیں ہیں، ہر ایک نے مکمل طور پر دستور اساسی کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ اور ہم اس وجہ سے کسی کو روک نہیں پا رہے کہ یہ چند ساتھی ہیں کہیں یہ بھی ناراض نہ ہو جائیں۔ مگر ہم اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک ہم قاعدے، قانون کے مطابق نہیں چلیں گے اور دستور اساسی کو فالو نہیں کریں گے۔ دوسرا بحیثیت ایک مومن ہم نے تحریک میں شمولیت کے وقت ایک فارم پر دستخط کئے ہیں کہ ہم نے علامہ پرویز کی پوری کتابیں پڑھی ہوئی ہیں، ہم ان کی فکر سے متفق ہیں۔ جو طریقہ کار ادارے نے وضع کیا ہوا ہے، ہم اس کو فالو کرتے رہینگے۔ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتے رہینگے لیکن جب ہم ایسا نہیں کر رہے تو ہم وعدہ خلافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ ہوتا رہا ہو چکا مگر آئندہ کے لیے میری سب سے درخواست ہے کہ آپ ایک بار پھر دستور اساسی کو غور سے پڑھ لیں، ایک ایک شق پر آپ دو بار سوچ لیں۔ اپنے اراکین کو بھی دستور اساسی پڑھائیں اور اپنی اپنی بزموں میں اس پر سختی سے کاربند رہنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد اگر کوئی خلاف ورزی ہوگی تو ادارے کی طرف سے جواب طلبی بھی ہوگی اور کارروائی بھی۔ یہ ادارے کا فرض ہے اور دستور اساسی میں موجود ہے۔

پہلے تو ہمیں یہ کلیئر کرنا چاہیے کہ جب ہم یہاں پر آئے ہیں تو کیا ہم علامہ پرویز کی فکر سے ان کے وضع کردہ طریقہ کار سے متفق ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو پھر ہمیں سختی سے قواعد وضوابط پر عمل پیرا رہنا چاہیے۔ اگر نہیں تو پھر ہمیں دورنگی اور منافقت چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ بابا جی کا فرمان بھی ہے جو میں کئی مرتبہ پیش کر چکا ہوں کہ قرآنی فکر وعمل طلوع اسلام کی اجارہ داری نہیں۔ جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جو لائحہ عمل اور طریقہ کار اپنے لئے مناسب سمجھے، اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص طلوع اسلام سے وابستہ ہے، اس پر طلوع اسلام کے قواعد وضوابط، روایات اور ہدایات کی پابندی لازم ہوگی۔

اس لئے آئندہ کے لیے خلاف ورزی کی صورت میں ہر نمائندہ بزم سے جواب طلبی ہوگی۔ اراکین کی ذمہ داری نمائندوں کی ہے۔ سب سے پہلے اگر میں نے غلطی کی تو میں اپنے آپ کو محاسبہ کے لئے پیش کرتا ہوں، اور آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے فلاں رولز کی خلاف ورزی کی ہے۔ ادارہ طلوع اسلام، تحریک کا مرکز ہے۔ اس ادارے میں ہم چند بندے ہیں ہم خود بھی دستور اساسی اور آئین وقانون کی پابندی کریں گے اور دوسروں سے بھی کرائیں گے۔ ابھی جو بات ہوئی، قرآن کنونشن کے حوالے سے، نیز قرآن کے نام پر بہت سارے پیجز کھلے ہوئے ہیں بہت سارے گروہ ہیں جو اپنی اپنی مرضی کے نظریات پیش کرتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہماری تحریک کو بے انتہا نقصان پہنچ رہا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو طلوع اسلام سے وابستہ سمجھ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بار بار اس حوالے سے اپنے رسالے میں وضاحتیں دینا پڑ رہی ہیں۔ حالانکہ بابا جی نے جو کچھ اس وقت سوچا، سمجھا، اور اس کے بعد تجربے کی بنیاد پر عمل میں لایا۔ ایسا نہیں ہے جو بعض ساتھی کہہ رہے ہیں کہ بابا جی نے کمپرومائز سے کام لیا ہے، بابا جی نے کبھی بھی کمپرومائز سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے جو کچھ سمجھا تو پھر اس پر سوچا

کہ کس طریقے سے ہم قرآن کریم کا پیغام آگے بڑھا سکتے ہیں، اور اس سے تعمیری نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ تو اس طریقے سے انہوں نے کام کو آگے بڑھایا۔ مگر بعض دوستوں نے وہ چیزیں چھیڑیں جو کہ چھیڑنے کی تھیں ہی نہیں، یعنی نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم مسلمان قوم کے افراد ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم مسلمان قوم کے افراد نہیں ہیں۔ تو ہم نے مسلمان قوم کے افراد رہتے ہوئے ان شعائر میں اسلام کی اساسی روح ڈالنے کی کوشش کرنی ہے۔ تاکہ ان کی رسمی ادائیگی کرنے والے، اسلام کی اصلی روح کو سمجھیں اور ان اصولوں کو اپنائیں۔ یہ جو ہمارے ملی شعائر ہیں، جو ابھی محض رسوم بن کر رہ گئے ہیں۔ ان میں روح ڈالنے کی کوشش کریں اور اس وقت تک کا انتظار کریں کہ جب خلافت علی منہاج نبوت وجود میں آجائے۔ ایک اسلامی سٹیٹ قائم ہو۔ تو پھر یہ اس اسلامی اسٹیٹ کا فریضہ ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے، ریاست کے شورائی نظام کے تحت، امت میں وحدت پیدا کرنے کی غرض سے اگر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے تو ان پر قرآن کی روشنی میں غور وفکر کیا جائے، ایسا فیصلہ پوری امت کی اجتماعی دانش کا فیصلہ ہوگا۔ کسی گروہ یا کسی فرد کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ اپنائے۔

دستور اساسی میں یہ بھی درج ہے کہ اگر کوئی بزم مقامی طور پر کوئی اور طریقہ کار آمد سمجھیں تو اس کیلئے ادارے سے اجازت لینے کی ضرورت ہوگی۔ دوسرا یہ کہ ہم میں سے کوئی پبلک میں چندہ اکٹھا کرنے کا مجاز نہیں۔ البتہ یہ بات نمائندہ کے صوابدید پر ہے کہ وہ اراکین سے کسی خصوصی پروگرام کے لئے ہنگامی چندہ کی درخواست کرے۔ باقی وہ ہے جو رکنیت فارم میں لکھا ہوا ہے۔ جب کوئی بزم کے فارم رکنیت پر دستخط کرتا ہے وہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ ماہانہ کتنا چندہ ادا کرے گا، کتنا وقت دے گا، یعنی جتنا وہ اپنی مرضی سے دے سکتا ہو۔ یا وہ متفقین جو کسی وجہ سے رکن نہ بننا چاہیں اور مالی معاونت کرنا چاہتے ہوں، تو وہ بھی نمائندہ کے صوابدید پر ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان سے چندہ لے سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کر سکتا کہ پبلک میں چندوں کے لئے اپیلیں کریں۔

چندوں کے لیے اپیلیں کرنا، یہ سب کچھ دستور اساسی کے منافی ہے۔ تو جو کچھ ابھی تک ہو چکا ہے اس سے ہم درگزر کرتے ہیں، مگر آئندہ کے لیے اس پر ہم سختی سے نوٹس بھی لیں گے اور متعلقہ نمائندگان سے جواب طلبی بھی کریں گے۔

یہاں ہمارے ساتھ جو ہمارے ایک دیرینہ اور بزرگ ساتھی تشریف فرما ہے جن کا نام اقلیم خان صاحب ہے اور ان کا تعلق سوات سے ہے اور جماعت اسلامی، کے تحصیل کے امیر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بارہا یہ نشاندہی کی ہے کہ ہماری تنظیم میں نظم نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہماری بزموں میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی موقع پر نظم کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ تنظیم کے قواعد وضوابط پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس لئے سب سے پہلے ہم نے اس پہ توجہ دینی ہے۔ ہم نے نمائندگان کی تربیت کرنی ہے۔ ابھی جو نمائندگان کی تربیت کے حوالے سے بات ہوئی، تو ہم انشاءاللہ آئندہ کنونشن کے موقع پر ان کے لئے کوئی خصوصی تربیتی پروگرام رکھیں گے۔ اگر ہم نمائندگان کی تربیت کریں گے، تو پھر ان کی ذمہ داری بنے گی کہ وہ اپنی بزموں میں اراکین کی تربیت کریں۔ ہمیں اکثریت کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں کوانٹٹی نہیں، کوالٹی چاہئے۔

ہم اکثر انقلاب کی بات کیا کرتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ کو علم ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ باباجی کو ایک دفعہ کسی نے کہا کہ آپ اتنے عرصہ سے لگے ہوئے ہیں مگر انقلاب کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے 13 سال کے عرصہ میں 313 افراد تیار کئے اور ان کے ہاتھوں انقلاب برپا کیا اور ایک اسلامی سٹیٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تو آپ کیوں اس طرح کا انقلاب برپا نہیں کر سکتے؟۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ٹھیک ہے، مگر بدر کے میدان میں جس قسم کے 313 مجاہدین تھے آپ مجھے ان جیسے 13 بدری دے دیں، میں انقلاب برپا کر دیتا ہوں۔ آپ یقین جانیں کہ ہم نے ابھی تک اس قسم کے 13 افراد تیار نہیں کئے، جن کا مال و جان سب اس مقصد پر نچھاور ہو اور جو ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔ ہم ابھی تک مفاہمت سے کام لے رہے ہیں۔ ہم کھلم کھلا یہ اقرار بھی نہیں کر سکتے کہ ہم اس تحریک کے ساتھ ہیں۔

ہم نے سوات میں علامہ پرویز صاحب کے یوم وفات کے سلسلے میں جو پروگرام منعقد کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ہم شخصیت پرست ہیں۔ میں نے اپنی پشتو تقریر میں وضاحت بھی کی تھی کہ ہم شخصیت پرست نہیں ہیں۔ مگر قرآن خالص کی اس ایک آواز کو دبانے کے لئے جس قسم کا پروپگنڈا کیا گیا ہے اور جس قسم کے کفر کے فتوے لگائے گئے ہیں، کہ قرآن خالص کی یہ ایک آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچ پائے۔ اس کے توڑ کے لئے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اس پروگرام کے ویڈیوز موجود ہیں اور نتیجے میں مخالفت بھی بڑھ گئی ہے، ہمیں تھریٹس بھی مل رہی ہیں۔ اپنے گھروں سے بھی مخالفت ہو رہی ہے اور سب سے زیادہ اعصاب شکن مخالفت اپنے گھروں کی ہوتی ہے کیونکہ اس مخالفت کی بنیاد دلی ہمدردی ہوتی ہے کہ اس طرح ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو ایسی مخالفت کو سہارنا اور برداشت کرنا سب سے مشکل ہے۔ مگر ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ (9:111) اور یہ جو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے سورہ توبہ کی آیت نمبر 24 میں:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (سورۃ التوبہ، آیت: 24)

(اے رسول!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہل خاندان، اور وہ مال و دولت جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جدوجہد، سے زیادہ عزیز ہے، تو پھر (تم اپنی اس رَوش کے نتائج کا) انتظار کرو، تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے، اس کے ظہور نتائج کا وقت آ جائے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔

یہ آیت ہمیں بار بار دہرانا چاہئے۔ تاکہ خود کو ہر وقت پرکھ سکیں۔

اور یہ جو تجاویز میں نے دی ہیں اور ابتدا میں جو آیت 2:214، میں نے تلاوت کی، وہ ثواب کی خاطر نہیں۔ بلکہ اس لئے تلاوت کے لئے تجویز کی تھی، تاکہ اس پہ سوچا جائے۔ کیونکہ ہم جو یہ صرف باتیں کیا کرتے ہیں اور مطمئن ہیں کہ ان

باتوں کی وجہ سے ہم جنت میں داخل ہونگے تو ایسا نہیں ہے۔ آپ میں سے جو لوگ باہر زندگیاں بسر کر رہے ہیں اور پوری زندگیاں آپ نے وقف کی ہوئی ہیں تو صرف اپنے مستقبل کے لئے، اس عارضی اور تھوڑی سی زندگی کے لیے۔ ابھی آپ دیکھ لیں کہ آپ نے کتنی اچیومنٹ کی ہے۔ تو وہ جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے، جس کو ہم نے کمانا ہے، اپنی ذات کے لئے کچھ کرنا ہے۔ ابھی تک تو ہم طبیعی جسم کے تقاضوں سے آگے نکل نہیں پائے، ابھی تک ہم کفر کی زندگی بسر کر رہے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (سورہ محمدؐ آیت:12)

جو لوگ حقیقت سے انکار کرتے ہیں (اور سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے) تو ان کی زندگی اور حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ انہی کی طرح کھاتے پیتے، سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے (اور مر جاتے ہیں)۔ اس تصور زندگی کا نتیجہ (شرفِ انسانیت کی) تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا.... حیوانوں کی طرح جیئے۔ حیوانوں کی طرح مر گئے۔ انسانی سطح زندگی ان کے نصیب میں ہی نہ ہوئی۔

ابھی تک ہم انہیں چیزوں میں پھنسے ہوئے ہیں ہم روٹی کے مسئلے سے باہر نہیں نکلے، کہ ذات کے نشوونما پہ ہم سوچیں، اپنے مستقبل کے لئے سوچیں۔ تو میری آپ سب سے گزارش ہے کہ آپ اپنے ہر کام پر قرآنی رہنمائی کی روشنی میں اس تحریک کے کام کو مقدم سمجھیں۔ آج پوری دنیا کے جو حالات ہیں اور ہمارے ملک پاکستان کے۔ اور روز حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے بابا جی کے کنونشن سے خطاب کا جو حوالہ دیا تھا، تو اس سے آپ سمجھ لیں کہ اگر ہم نے ابھی بھی غفلت برتی، لوگوں کو قرآن کریم کا پیغام نہیں پہنچایا، تو یقین جانیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہم جواب دہ ہونگے۔ کیونکہ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے، تھوڑی سی کوشش ہمیں کرنا چاہیے۔ ہمارے لئے سب کچھ بابا جی نے مرتب کر کے رکھ چھوڑا ہے، صرف پھیلانا، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو پھیلائیں۔ اس میں غفلت کرنا اپنے آپ پر زیادتی کرنا ہے۔ اس لئے میری آپ سے درخواست ہے کیونکہ ہم ساتھی ہیں، ہم قرآنی برادری ہیں، ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ہم ایک دوسرے کی بھلائی چاہتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی ہے کہ جتنا ہم سے ہو سکے جتنا وقت ہم دے سکیں ہم قرآنی تعلیمات کو پھیلائیں، عام و خاص تک پہنچائیں۔ وہ قبول کرتا ہے یا نہیں وہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ مگر ابلاغ کا جو فریضہ ہے اسکو ہر کام پر مقدم سمجھنا ہے، اسی کو اولیت دینی ہے۔ آپ نے کافی وقت دیا۔ وقت پر بھی اکثر بات ہوا کرتی ہے کہ آپ وقت کا تعین کیا کریں، مقررہ وقت سے زیادہ نہ لیں۔ تو میں اس پر بھی معذرت چاہتا ہوں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پروگرام دیا گیا تھا تو آپ نے پروگرام میں کمی نہیں کی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ آپ کو رات میں کچھ وقت کے لئے آرام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ کے ساتھ آپ کے ساتھی بھی ہوتے ہیں، اور پھر دن کو ان کو بہت سارے کام کرنے ہوتے ہیں۔ تو ہم بھی وہ پیغمبرانہ مشن لے کر اٹھے ہیں، ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت دے کہ ہم اس پروگرام پر ثابت قدم رہیں اور جو ہمارے فرائض ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم ان کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔ بہت شکریہ

پرویز علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(جس کے خلاف شر انگیز اعتراضات کئے جاتے ہیں)

مطالبۂ پاکستان کی اساس

دوقومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی نگاہوں میں)

ذیل کا مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی 21 نومبر 1980ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرویز صاحب کی نظرثانی کے بعد، نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔

17 اکتوبر 1980ء کے نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا۔۔ ''کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔'' اس میں ضمناً دوقومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیرِنظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور ابھار کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائداعظمؒ کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''دوقومی نظریہ'' کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیے اور اس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کرہ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مِل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10:19)

ابتداء میں نوعِ انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے اُمت واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارشاد ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (2:213)

''نوعِ انسان شروع میں ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین بھی نازل کیا تا کہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے اُمت واحدہ بنا دیں)۔''

نوعِ انسان کی اُمت واحدہ' سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفریق نے قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔ اور اب اس دور میں' اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفریق کے لئے کرہ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانش کدوں) سے مسلسل اٹھ رہی ہے (یہ بہرحال دوسرا موضوع ہے) آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق' خون' رنگ' نسل' زبان' وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوئی۔ حضرات انبیاء کرامؑ نے (وحی خداوندی کی رُو سے) کہا کہ یہ معیار تفریق باطل ہے۔ حقیقی معیار تقسیم' فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور مستقل اقدار خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصورِ حیات میں ہم آہنگ ہوں' وہ رنگ' نسل' زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآنِ کریم میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ (64:2)

''خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار کر دیا' دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔''

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطح زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے' تفریق انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اس معیار تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا

بھی دیا۔ سلسلہ وحی کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوح علیہ السلام ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بر وحی نظریہ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے اس صحیح روش زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ:

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (19:48)

''میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔''

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ:

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4)

''ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔''

كَفَرْنَا بِكُمْ ۔ ''ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں''۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4) ''تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔'' اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے، اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4) اس لئے کہ اس عالم گیر اصول زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ (14:36)۔ ''جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے'' اور میرے ''اپنے'' جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (66:10-11) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا۔

قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ:

تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیل قومیت کے مطابق حبش کا بلال، فارس کا سلمان اور روم کا صہیب رضی اللہ عنہم محمد عربی ﷺ کی ''اپنی قوم'' کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب ''غیر قوم'' کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آ گیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل

اِدھر۔نہیں' اور آگے بڑھیے۔ اِدھر خود محمد ﷺ تھے تو ان کے مدمقابل آپ ﷺ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت' جو وطن' رنگ' زبان' نسل' رشتہ داری کے تمام حدود وثغور سے بلند ہوکر' خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمت محمدیہ' وہ ملت اسلامیہ۔ وہ جماعت مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط (8:72) ''ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔'' اور ان کے مقابلہ میں' نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط (8:73) ''ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز''۔ اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کردی کہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (3:118)

''اے جماعت مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔''

اس لئے کہ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ط ''یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔'' وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ج۔ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ص وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ط۔ ان کے بغض وعداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (3:118) ''ہم نے تمہیں واضح طور پر امور سے آگاہ کردیا ہے۔ اگر تم عقل وفکر سے کام لوگے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ز ''اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔'' وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ط (3:120) ''اور اگر انہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی' بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (Establish) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے 24:55) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ' تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (5:44) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فروعی قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (42:38)۔ ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امور مملکت میں شریک ودخیل کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتاً

جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ ''قوم مسلم'' کے افراد نہیں تھے۔

صدرِ اوّل کے بعد:

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد' جب دین' مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہمات اصول کی طرح' قومیت کا نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی' دیگر قوموں کی طرح' نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاد دہانی کرائی کہ اُمت محمدیہ ﷺ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا' اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری اُمت' ایمان کے اشتراک کی بنا پر اُمت واحد ہے۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہونے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے' چنداں تعجب انگیز نہیں' لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ 1905ء میں (جب اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصول تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوام یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظامِ نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مدار قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو' متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محو حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہندی ہیں ہم' وطن ہے ہندوستان ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ ؎

چین و عرب ہمارا' ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ ؎

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور وہ واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظام زندگی کی اصل اور بنیاد تھا' اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدومد سے پیش کرتے تھے' اس کا اندازہ اس نظم سے لگایئے جو بانگ درا میں ''وطنیت'' کے عنوان سے درج ہے اور اس میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے' تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے! اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت:

میں نے اپنے مقالہ (شائع شدہ نوائے وقت' بابت 17 اکتوبر 1980ء) میں یہ بتایا تھا کہ جب قائداعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند ان کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع 1938ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ۔۔۔ ''قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں' مذہب سے نہیں''۔۔۔ ہندوستان کے سب سے بڑے (دارالعلوم' دیوبند' کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان' کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافِ اسلام نعرہ کو سنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ ابھری' جو ان الفاظ کی شکل میں' فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ ممبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

ان اشعار میں ''بمصطفی برساں خویش را'' کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے' لیکن اُمت کی تشکیل اس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس

کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو اُمت محمدیہ ﷺ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسول ﷺ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (6:159)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ فرقے' پارٹیاں' قومیں بن جائیں' اے رسول ﷺ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی اگر قومیت کی اساس' اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسول ﷺ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر' علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے' رسول اللہ ﷺ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت' وطن کے بجائے حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف کرو۔

بمصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔۔۔ اگر باو نرسیدی۔۔۔ اگر تم نے اپنی نسبت حضور ﷺ کی طرف نہ کی تو۔۔۔ تمام ابولہبی است۔۔۔ پھر دین باقی نہیں رہتا' ابولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا۔

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابل قدر اور اہم تھا تو رسول اللہ ﷺ کے بعض اقارب' ہم نسلوں اور ہم قدموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت' ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔۔۔ محمد ﷺ (فداہ ابی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی' لیکن جب محمد ﷺ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے' وہ سب اُمت مسلمہ یا ملت محمدیہ ﷺ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے' اب ''ملک و نسب'' ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را نہ داند نکتۂ دینِ عرب را!
اگر قوم از وطن بودے' محمد ﷺ ندادے دعوتِ دیں بو لہب را

حضور رسالتمآب ﷺ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو' ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے' ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضور ﷺ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی' نبی آخر الزماں ﷺ کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن

اُمت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر، اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُمت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ اُمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) پر ایمان لے آتا ہے وہ اُمت عیسیٰ علیہ السلام سے کٹ کر ایک نئی اُمت (یعنی محمدیہ ﷺ) کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے اگر کوئی شخص، محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمت محمدیہ ﷺ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پاجاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، اُمت محمدیہ ﷺ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی اُمت محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ:

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں ''انکارِ خاتمیت'' کا۔ نظریہ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوّت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوّتِ محمدیہ ﷺ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی نسبت کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذات رسالتمآب ﷺ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید اُمت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو ''معرکہ دین و وطن'' کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آراء بیان کو یہاں درج کرایا جائے، لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔۔۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آرہا ہوں)۔

(ضمناً) مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آج کل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لائے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اسی کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ بار دیگر، طلوعِ اسلام بابت جولائی 1975ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا۔ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا تو اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محو حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناح جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشہ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہین منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا، اس حقیقت کی پردہ کشائی قائداعظمؒ کے سوانح حیات کے انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> اپنے قیام لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔
>
> (صفحہ:99)

جناح انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں ''جناح کانگریس ہال'' دے رہا ہے اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائداعظمؒ نے اسلام کے اس تصور قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا، اس کی مثالیں آگے چل کر پیش پیش کی جائیں

گی۔لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا تبصرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔انہوں نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:

> پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آ گیا اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے ایڈورڈس کالج' پشاور میں 27 نومبر 1945ء کو کہا تھا:

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین' ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے' آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں (مارچ 1937ء میں) کہا تھا کہ:

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو' مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔جدید دنیا میں دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائداعظمؒ نے اس تصور قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ 15 ستمبر 1944ء کو) ایک خط میں لکھا:

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو' وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط' یوں سمجھئے کہ قائداعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے' مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ:

> اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے' نہ شک وشبہ' کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک

ایک ہے۔ یہ برصغیر اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے' تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔۔۔ (لہٰذا' مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی وکاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی' سیاسی' معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں' اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور وشغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (جناحؒ کا خط بنام گاندھی' جنوری 1940ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 1940ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبہ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی' اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ''مذہب'' نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھئے' ہندو اور مسلمان' مذہب کے ہر معاملہ میں دو دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس' کے خطبہ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:

مسلم لیگ کے نصب العین کا یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی' اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این، سی دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بجنور کی یکم فروری 1940ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:

> ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے یہ میرے خیال میں، اب نہیں، تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ البتہ اس میں ترمیم واصلاح کر کے، اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور دو قومی نظریہ کی بناء پر پاکستان وجود میں آ گیا۔ اس موضوع پر، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے مقالہ (مندرجہ نوائے وقت مورخہ 17 اکتوبر 1980ء) میں کہا تھا کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے موید وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی، لیکن نظریہ، قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ ''مسلمان اور غیر مسلم'' اشتراک وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں:

انہوں نے (11 اگست 1947ء) کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) 13 جولائی 1947ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں، اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات وعبادت کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلاتفریق مذہب وملت ورنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔

(بحوالہ نوائے وقت، مورخہ 19 جنوری 1978ء)

11 اگست کے بعد:

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی 11 اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) 14 اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے اُمید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے کیا تھا۔ قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصول پر عمل کیا اور انہیں پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جز نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطہ نگاہ سے ''دوقومی نظریہ'' کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائداعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں

یقین دلایا کہ یہاں ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے 11 اکتوبر 1947ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے، 30 اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیے اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہ افتخار ہونا چاہئے۔

3 فروری 1948ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ ''حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بداعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے۔'' انہوں نے 19 فروری 1948ء کو اسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں، اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت۔۔۔ ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا:

اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے۔۔۔ اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں

سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے۔۔۔ اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی۔ شیعہ سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:

میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ''ایک قوم'' کہا ہے اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں۔۔۔ فرمایئے کہ ایسا کہنے والا ''دوقومی نظریہ'' کا علمبردار تھا، یا متحدہ قومیت کا۔

انہوں نے 26 مارچ 1948ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

13 جون 1948ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلاتمیز مذہب وملت اور بلالحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص، نظریہ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے 19 فروری 1948ء کو اسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ:

یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس

اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف واحترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم وروایات، ہم اپنے نظریات زندگی، نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزا کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزا نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا اُمت مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراک وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

انہوں نے 14 اگست 1948ء کو مملکت پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو ''دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ'' کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے ''مسلم سٹیٹ'' کہا ہو اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرین سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ:

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ، اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

لہٰذا، قائداعظمؒ کا مملکت پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

نئی نسل کی تعلیم:

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد، ملک کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں گذارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ قومیت کا تصور دینا رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آگئے ہیں، لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریات سیاست سے متاثر ہوکر، سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہوجائے گا، اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہوجائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گذارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ وپے میں سرایت

کرتا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (Dawn Pakistan) کی اشاعت بابت 7 مئی 1969ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بناء پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ:

> ہم شری چیتیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ، جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے، اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا، یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد لکھا تھا:

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتہ مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے، لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک، عزیز الرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ 1971ء کی جنگ کے بعد، سقوط ڈھاکہ کے جگر خراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ:

> ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے لیکن چوبیس سالہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثابت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ

لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے' وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا' حقائق کسی کے جھٹلائے جھوٹے ثابت نہیں ہوجایا کرتے۔

مسز اندرا گاندھی:

ادھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی بھارت کی وزیر اعظم) مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشن ''فتح بنگالہ'' پر ہدیہ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ:

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی' یہ کامیابی ہے' حق پر مبنی نظریہ کی' اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب 25 سال کے تجربہ نے بتادیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے' وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دولخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ 1968ء میں کراچی کی ''عوامی ادبی انجمن'' کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر ''دانشوران قوم'' جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں' ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یعنی سیکولر مملکتوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ ''ارباب دانش'' سیکولر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے! اِدھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اس قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے 1973ء میں ''ٹائمز آف انڈیا'' کے نمائندے' مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے

اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لیے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔'' انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب 1969ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ:

میں نے دوقومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب معیار کس طرح ہوسکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی' لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کرلوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہوسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(سٹیٹمین 16 اکتوبر 1969ء' بحوالہ پاکستان ٹائمز 19 مارچ 1973ء)

ادھر والد بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادے خان عبدالولی خاں' یہ اعلان کر رہے تھے۔ دوقومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔

(نوائے وقت' 13 اکتوبر 1972ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم' عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ ''حریت'' کی اشاعت بابت 4 نومبر 1968ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ:

وہ اسلام اور پاکستان' جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے' ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت' سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجوڈارو۔ کوٹ ڈی جان کے آثار قدیمہ' اور لطیف' سچل' ایاز' جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے) (طلوعِ اسلام' دسمبر 1968ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی (اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے) اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک اور بیٹی' غزالہ بلوچ۔ کا ایک خط اخبار ''ڈیلی نیوز'' کراچی کی 19 اگست 1972ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا:

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری' پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پرمسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان۔۔۔ ایک

پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت، اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کرتے رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے 1947-1946ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہوجاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دوقومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔

(طلوعِ اسلام، اکتوبر 1972ء، صفحہ نمبر: 43)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہوگئی تھی وہاں کے ''بزرگ سیاستدانوں'' نے جب اپنی گاڑی کا رخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہوگئی۔ سندھ کی ''بزرگ ترین سیاسی شخصیت'' مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ اوائل 1972ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دوقومی نظریہ، مذہبی نظام حکومت کا تخیل۔ فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔

24 سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دوقومی نظریہ کو خیر باد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خودمختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔

(المسبر 4 فروری 1972ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں کے (اس زمانے کے) وزیر اعلیٰ، سردار عطا اللہ مینگل نے 1972ء میں کہا تھا کہ:

جس دوقومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔

(نوائے وقت، 18 اکتوبر 1972ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:

پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب وثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی۔

(نوائے وقت، 14 اکتوبر 1972ء)

(کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟) میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیرِنظر مقصد کے لئے سردست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں)

اس وقت تک دوقومی نظریہ سے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ شروع میں کہا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریک پاکستان کے کسی سیاسی جذبۂ محرکہ کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ، یا اس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے، اس لئے کوئی اہلِ ایمان، جہاں بھی ہے، وہ عظیم اُمت مسلم کا فرد ہے اور جغرافیائی بعد اور مسافت اسے نہ اس امت سے الگ کرسکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دوقومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا تو اسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ (پاکستان کا اس زمانے میں ابھی تصور تک بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا)۔ انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا دیا (مثلاً) انہوں نے 1922ء میں، پہلی جنگ عظیم کے بعد، جب تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالم اسلام کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت وزبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر!

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (1923ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوعِ اسلام، میں انہی اقوام کو مخاطب کرکے کہا کہ ؎

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پَر تیرے! تو اے مرغِ حرم‘ اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحدتِ اُمت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے‘ اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدتِ اُمت لازم وملزوم ہیں لیکن مسلمانانِ عالم‘ جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے‘ انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریئے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطۂ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتداء ہندوستان سے کی۔ انہوں نے اس خطۂ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اسلام‘ دوقومی نظریہ‘ اور پاکستان ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آ گیا‘ لیکن یہ دیکھ کر تاسف ہی نہیں‘ صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف‘ ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک اُمت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں‘ درحقیقت نسلی تفریق ہے‘ اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں‘ برادریوں‘ گوتوں تک میں بٹے ہوئے ہیں‘ اور باہمی تفریق وتقسیم کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم میں قدر مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم۔۔۔ دوقومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہٰذا‘ جہاں ہم ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دو قومی نظریہ کے مخالف ہیں‘ ہمیں ان لوگوں کی بھی اسی طرح‘ مخالفت کرنی چاہئے جو لفظی طور پر تو دوقومی نظریہ کے قائل ہیں‘ لیکن عملاً ایک اُمت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ اُمت کی تشکیل کا ہے۔ جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے‘ اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔

کاروبار کیسا بھی ہو اس کو فروغ دینے میں ویب سائٹ نہایت کارآمد ہے۔
ہر طرح کی ویب سائٹ بنوانے کے لئے ہم سے رجوع کریں۔
تعلیمی، قانونی، آن لائن سٹور، سفریات، کھیل، ہوٹل، ہوم ڈیلیوری، ذاتی وغیرہ
مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں یا ویب سائٹ وزٹ کریں
Jamshed Tech
WhatsApp: +92 335-7651490
https://www.jamshedtech.com

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(سورۃ النساء آیات 160 سے 161 تک)

درسِ قرآن

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَہُمۡ وَبِصَدِّہِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِہِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُہُوۡا عَنۡہُ وَاَکۡلِہِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۶۱﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1971ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النساء کی آیت 160 سے ہو رہا ہے: (4:160)۔

پچھلے اتوار کو عید الاضحیٰ کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل کے ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا جن کی پاداش میں' پاداش کا لفظ ہم بولتے ہیں کہ ہماری زبان میں یہی لفظ ہے' ورنہ اصل میں تو یوں کہیے کہ جس کے فطری نتائج کے طور پر' اس قوم پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی' وہ تباہی اور بربادی کے عمیق گڑھوں میں جا گری' صدیوں تک وہ دوسروں کی غلامی اور محکومی کے چنگل میں جکڑی رہی۔ ان جرائم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی تسلسل میں قرآنِ کریم نے ایک اور بات کہی ہے جو آج کی اس آیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

> ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے' پابندی صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب نے اس پر عائد کی۔ آزادی' بلا پابندی سرکشی کہلاتی ہے جیسے سفر بلا تعین مقصد آوارگی کہلاتا ہے۔

لفظ حلال' حرام اور طیّب کا قرآنی مفہوم اور اس کے استعمال کی وضاحت:

کہا ہے کہ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَہُمۡ وَبِصَدِّہِمۡ (4:160) ان کے جرائم کی وجہ سے ایک اور سزا جو اِن کو ملی' وہ یہ تھی کہ حلال اور طیّب چیزوں میں سے بعض چیزیں مثلاً تمام ناخندار جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآنِ حکیم نے یہاں کہی ہے۔ حلال اور طیّب چیزوں کا حرام قرار دینا' جرائم کی سزا کی بنا پہ قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ یہاں سے بڑا اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حلال اور حرام کا اصول کیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے حلل کے معنی ہوتا ہے ''رسیاں کھول دینا' رسیوں کے بند کھول دینا' آزاد کر دینا' پابندیاں اٹھا دینا''۔ اور اس کے برعکس دوسری چیز ہے جسے حرام کہا جاتا ہے جو ''ح ر م'' ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں

''کسی تک پہنچنے سے روک دینا' حفاظت پیدا کر دینا' پابندی عائد کر دینا' ممانعت عائد کر دینا''۔ ممانعت کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کی عزت و عظمت و تحریم و تکریم کی بنا پر اس تک ہاتھ بڑھانے سے کسی کو روک دیا جائے۔ یہ جو لفظ احترام ہے' اس کا مادہ بھی وہی ''ح ر م'' ہے جہاں سے لفظ حرام ہے۔ اور لفظ حرام بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کعبہ کے لیے مسجد الحرام میں تو قرآنِ مجید میں آیا ہے' ابھی محرم الحرام ہمارے ہاں مہینہ آنے والا ہے۔ حرمات کے جو چار مہینے ہیں' وہ اسی میں ہیں۔ احترام کی وجہ سے کسی چیز تک نہ آنے دینا یا کوئی شے نقصان کا باعث ہے' نفرت کا موجب ہے' اس سے باز رہنا۔ تو گویا اس کی وجہ سے یہ دونوں ہو سکتی ہیں یعنی تعظیم و احترام بھی اور اس سے نفرت اور نقصان بھی۔ ان میں سے کسی وجہ سے' کسی چیز کا روک دینا' نہ پہنچنے دینا' مثلاً یہ کہ ماں یا بہن یا بیٹی سے نکاح حرام ہے' یہ جو حرمت ہے' ان کے احترام کی بنا پر ہے۔ اور یہ چیز کہ لحم خنزیر حرام ہے' یہ حرمت اس کے نقصانات کی بنا پہ ہے' نفرت کی بنا پہ ہے' احترام کی بنا پہ نہیں ہے۔ تو یہ حرام کا لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے: عربی زبان میں بھی' قرآنِ کریم میں بھی' احترام کے لیے بھی اور حرام ہونے کے لیے بھی۔ یہاں یہ چیز کہی ہے کہ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (4:160) وہ خوشگوار چیزیں (میں ابھی عرض کروں گا کہ حلال کے ساتھ طیّب بھی کیوں قرآنِ مجید نے کہا ہے) جو حلال تھیں ان کے بعض جرائم کی بنا پر وہ ان پر حرام قرار دیدی گئیں۔ کسی کو کسی شے سے روک دینا' یہ اس پر پابندی عائد کرنا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا گیا ہے اور تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی غلامی اور محکومی میں نہ رہے۔

کسی انسان کو کسی انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں:

کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی پر از خود من مانی پابندیاں عائد کرے۔ پابندیاں عائد کرنے کا نام ہی تو غلامی ہوتا ہے۔ اس کے لیے جو قرآنِ کریم نے اصول بیان کیا ہے وہ بڑا بنیادی ہے' بڑا اہم ہے' دین کا نقطۂ ماسکہ (Focal Point) ہے۔ کہا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' دیکھئے! کس قدر حتم و یقین یا تھدی کے ساتھ یہ آیت آئی ہے' کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اسے قانون سازی کا اختیار حاصل ہو' خواہ اسے حقِ حکومت حاصل ہو' خواہ اسے نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بن جاؤ۔ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے' صاحبِ حکومت' صاحبِ کتاب ہونا تو ایک طرف رہا' جو صاحبِ نبوت ہونا ہے اس سے بھی یہ اختیار کسی کو نہیں ملتا کہ وہ کسی شخص کو اپنی غلامی' محکومی کے اندر اور پابندی کے اندر لے آئے۔ میں کہتا ہوں کہ حریت انسان کا اس سے بڑا منشور دنیا میں کہیں نہیں آیا۔ دیگر مقامات میں تو خیر پھر بھی Freedom & Independence (آزادی و حریت) کی یہ چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں مگر یہ چیز کہ

جسے نبی مانا گیا ہو' جس پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن کہلا سکے' اس کے متعلق بھی یہ کہا جائے کہ اسے بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص پر از خود کوئی پابندی عائد کرے۔

پیرومرشد کی غلامی تو انسان کے دل و دماغ کے اطراف نہیں ہوتی' بیل کی طرح چھائی ہوتی ہے:

کہا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)۔ عزیزانِ من! کتنی عجیب چیز ہے اور یہ آیت بڑی ہی غور طلب ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہ کہے کہ تم سب ربانی بن جاؤ۔ اب جو ربانی بننا ہے' قرآنِ کریم نے ایک بڑی Abstract (غیر محسوس) سی چیز کہی کہ کیسے ربانی بن جاؤ۔ ہماری خانقاہیت میں پیرومرشد کے آستانوں پر انکی بیعت سے بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں ربانی بنا رہے ہیں۔ اور اس میں جس قسم کی غلامی اور محکومی ہوتی ہے' اتنی گہری غلامی تو یہ Physical (جسمانی) غلامی بھی نہیں ہوتی' ان کا تسلط و تغلب تو انسانوں کے قلب اور دماغ پہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ کہیں گے کہ تمہیں چاہیے کہ تم ربانی بن جاؤ۔

ربانی بن جانے کا طریق صرف خدا کی کتاب کی ہی پیروی ہے

سوال یہ ہے کہ آخر ربانی بننے کا ذریعہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ ہے اہم چیز۔ قرآنِ حکیم ان چیزوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا' وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں اس چیز کا امکان ہوسکتا ہے کہ اس کے ذرا سے غلط مفہوم سے بات کہیں سے کہیں چلی جائے۔ کہا ہے کہ تم ربانی بن جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سے ربانی بن جاؤ؟ کہا کہ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) یہ جو خدا نے کتاب نازل کی ہے اس کتاب کی تعلیم سے' اس کتاب کی درس و تدریس سے' تم ربانی بن جاؤ۔ یعنی اب دنیا میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا جو ذریعہ ہے وہ اس کی یہ کتاب ہے۔ ربانی بننے کا ایک ہی ذریعہ اس کتاب کی تعلیم و تدریس ہے' کوئی باطنی علم نہیں ہے' کوئی اور ریاضتیں نہیں ہیں' کسی قسم کے مشائخ کی بیعتیں نہیں ہیں۔ صاحب نبوت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ کسی کو اپنی غلامی اور پابندی میں جکڑے' وہ بھی صرف تعلیم و تدریس کرنے کے لیے آتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ دنیا میں بہت بڑا آزادی کا منشور ہے۔ پابندی صرف وہ پابندی ہے جو خدا نے عائد کی ہے اور وہ جو پابندی ایسی نہیں کہ کوئی شخص اپنی طرف سے کہہ دے کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہ پابندی عائد کرو بلکہ خدا نے خود اپنی کتاب میں اس پابندی کی تصریح کر دی ہے۔ تو سمٹ کر بات یہاں آ گئی کہ ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے' پابندی صرف وہ ہے جو خدا کی کتاب نے اس پر عائد کی۔ آزادی' بلا پابندی سرکشی کہلاتی ہے جیسے سفر بلا تعینِ مقصد آوارگی کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی ضابطے کی پابندی نہ ہو تو وہ آزادی نہیں ہوتی' وہ سرکشی ہوتی ہے۔ یہ وہی ہے جو آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

خود ساختہ شریعت کی طرف سے وضع کردہ پابندی کی نوعیت اور اثرات

عزیزانِ من! پابندیاں مختلف قسم کی ہوسکتی ہیں: بیمار پہ ڈاکٹر پابندی عائد کرتا ہے کہ فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرو' یہ تم

نے نہیں کھانی۔ یہ غلامی نہیں ہے' یہ محکومیت نہیں ہے۔ یہ پابندی اس کے حق میں منفعت بخش ہے۔ پابندی جو حکومت کے قوانین عائد کرتے ہیں کہ بائیں طرف چلنا ہے' دائیں سے نہیں جانا' وہ غلامی نہیں ہے' یہ ان کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس قسم کی پابندی کہ برسات کے موسم میں جب ہیضے کا خطرہ ہوتا ہے تو ہیلتھ آفیسر کہہ دیتا ہے کہ امرود اور کھیرے نہیں کھانے' یہ پابندیاں آپ کی منفعت کے لیے ہیں۔ اس چیز کی پابندی کہ ہفتے میں دو دن گوشت کا ناغہ رہے گا' نہیں پکے گا' نہیں کھایا جائے گا' یہ تمدنی پابندیاں ہیں' وقتی پابندیاں ہیں' مصلحت کے تابع عائد کی جاتی ہیں لیکن اگر کسی پہ کوئی شخص یہ پابندی عائد کرے یعنی کسی ایک پر نہیں بلکہ یہ پابندی مسلمان قوم پر عائد کر دی جائے کہ فلاں چیز کا کھانا تم پر حرام ہے تو ذرا اس پابندی کی گہرائیوں اور وسعتوں پر غور کیجیے کہ اگر ایک شخص نے آج سے ہزار برس پہلے یہ بات کہی اور یہ مان لیا گیا کہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ بات کہے' جسے آپ شرعی پابندی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ وہ اپنے سامنے کے مخاطب لوگوں سے ہی نہیں کہہ رہا' کسی ایک فرد سے نہیں کہہ رہا بلکہ وہ پوری قوم سے کہہ رہا ہے اور قیامت تک کے لیے آنے والے انسانوں کے اوپر پابندی عائد کر رہا ہے۔ ارے اس سے گہری اور بڑی غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کا فیصلہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے اوپر سخت زنجیروں کی طرح عائد کر دیا جائے کہ وہ اس سے رتی بھر تجاوز نہ کر سکیں' تبدیل نہ کر سکیں' اس سے ہل نہ سکیں۔ اس کے لیے پاداش اور اس سے انحراف کی سزا اس دنیا میں اس قوم کے سامنے جو بھی تجویز کریں' اور یہ کہ قیامت میں وہ جہنم میں بھی جائے۔

انسان کی آزادی اور پابندی کی حدود صرف اور صرف خدا کی کتاب متعین کرتی ہے:

ظاہر ہے کہ کسی انسان کو قرآنِ حکیم یہ حق نہیں دے سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں اصول ہی عجیب بیان فرمایا ہے۔ عام طور پر یہودیوں کی شریعت میں بھی' ہندوؤں کے ہاں بھی' کہا یہ جاتا تھا کہ فلاں فلاں چیز تم کھا نہیں سکتے ہو یعنی عام پابندی ہوتی تھی' عام چیزیں حرام تھیں' ان میں سے فلاں فلاں چیز کی اجازت دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بالکل اس کے برعکس بات کہی۔ اس نے یہ کہا کہ جو کچھ بھی خدا نے پیدا کیا ہے سنو! يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (2:172) جو کچھ بھی خدا نے یہ سامانِ زیست پیدا کیا ہے' اسے تم کھاؤ پیو۔ گویا اس کا جو عام حکم ہے وہ حلال ہونے کا ہے۔ جن چیزوں پہ زندگی کا دارومدار ہے' جسے قرآنِ مجید میں سامانِ زیست کہا جاتا ہے' جسے رزق کہہ کر پکارتا ہے' وہ حلال ہیں' کھاؤ پیو اس پہ خدا کی سپاس گزاری کرو۔ اور یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (2:172) اگر صرف اس کی غلامی کا طوق تم نے ڈالا ہے' صرف اس کے محکوم رہنا چاہتے ہو' چاہتے ہو کسی اور کی پابندی اور محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑے جاؤ' تو اس کے لیے یاد رکھو! جو کچھ سامانِ زیست پیدا کیا ہے اس کو مزے سے کھاؤ پیو۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ (2:173) بس یہ سمجھ لو کہ یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ یعنی یہاں جو عام حکم ہے' وہ حلت کا ہے حلال ہیں' صرف یہ چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حرام چیزوں کی تعداد کا معاملہ اور ہمارا شب و روز کا عمل:

کہا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) حرام صرف یہ چیزیں ہیں: بہتا ہوا لہو' یہاں صرف ''دم'' (خون) کہا ہے' دوسرے مقام پہ سورۃ الانعام میں دَمًا مَّسْفُوْحًا (6:145) کہا ہے اور وہ ہے بہتا ہوا لہو یعنی وہ لہو جو ذبح کرنے کے بعد بھی جانور کے بعض حصوں کے اندر باقی رہ جاتا ہے تو وہ بہتا ہوا لہو نہیں ہوتا' اس لیے اس کی تخصیص کر دی گئی۔ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ (2:173) سور کا گوشت۔ یہ حرام ہے۔ یہ جسے آپ کھانے پینے کی طبعی چیزیں کہتے ہیں وہ یہ تین ہیں: (1) مردار' (2) بہتا ہوا لہو اور (3) خنزیر کا گوشت۔ یہی تین طبعی چیزیں ہیں جنہیں قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا ہے۔ ایک مقام پہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے اور یہی تین طبعی چیزیں ہیں۔ چوتھی چیز ایک اور بھی ہے اور اس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ وہ ہے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے وہ بھی حرام ہے۔ تو یہ چیزیں حرام ہو گئیں: مردار' بہتا ہوا لہو' سور کا گوشت اور ہر حلال چیز جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ یہ ہیں حرام قطعی۔ یہ چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جو گنائی ہیں۔ پہلی تین چیزوں کے متعلق تو ہم میں سے ہر ایک کو علم ہے۔ مردار تو خیر کوئی کھاتا نہیں' نہ ہی وہ لہو پیتا ہے اور خنزیر کے گوشت کے متعلق تو مسلمان کے دل میں جتنی نفرت ہے' وہ ہمیں معلوم ہے۔ جس چیز کے متعلق آپ نے حتمی طور پر یہ کہنا ہو کہ آپ اس کو چھوتے نہیں آپ کہتے ہیں کہ میں تو اس کو خنزیر سمجھتا ہوں۔ کیا اس چوتھی چیز کے متعلق بھی کبھی آپ کی توجہ گئی ہے کہ قرآنِ مجید یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ روز جو آپ کے ہاں گیارھویں والے کی نیازیں اور ساتویں والے کی نذریں ہوتی ہیں' یہ میرمجو کے بکرے ہوتے ہیں اور فلاں قبر کے اوپر یہ کچھ چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے' یہ کیا ہے؟ یہ ہے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173) ہر حلال اور طیّب شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ عزیزانِ من! سوچیے' سور کھانے کے نام پر جن کو ابکائی آ جاتی ہے' وہ نہایت مزے سے بیٹھے ہوئے یہ سارا کچھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ جو عام کھانا ہے اس کی تو کبھی بے حرمتی ہو جائے تو کہتے ہیں کہ خیر' کچھ مضائقہ نہیں مگر اس میں یہ قبول نہیں ہے۔

علامہ پرویزؒ کے بچپن کی گستاخی کا ایک واقعہ جو نیاز کے تبرک کی بے حرمتی کا نتیجہ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے

ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ نیاز کے دانے میں تقدیس آ جاتی ہے۔ مجھے آج تک یہ گال پر طمانچہ یاد ہے' بچپن میں یہ گستاخی ہو گئی تھی کہ ایک جگہ نیاز کا تبرک بٹ رہا تھا تو اس کے لینے کے لیے ہم نے یہ ہاتھ آگے کر دیا' حضرت صاحب نے اُدھر سے ایک طمانچہ مارا' کہا کہ ''نیاز قبول کرنے کے آداب بھی تمہیں پتہ نہیں ہیں' ایک ہاتھ میں نیاز لیتے ہو! دونوں ہاتھ کرو''۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ تھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (2:173)۔ قرآن کریم نے جسے حرام قطعی قرار دیا ہوا تھا' اس کا واجب

الاحترام ہونا اتنا ہو گیا کہ اسے ایک ہاتھ میں لینا اس نیاز شریف کی اتنی بڑی گستاخی سمجھی گئی۔ یہ عجیب قوم ہے۔ دیگیں پک رہی ہیں' نیاز بٹ رہی ہے اور اس میں ایک تقدیس ساتھ شامل ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہی چوتھی حرام قرار دی ہے۔

اضطراری حالت میں حرام چیز کے استعمال کی اجازت:

عزیزانِ من! یہی چار چیزیں ہیں قرآنِ کریم نے جنہیں حرام کہا۔ اس میں بھی آگے قرآنِ مجید کی یہ استثنا عجیب چیز ہے۔ کہتا ہے کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (2:173) اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ اضطراری حالت پیدا ہو جائے' کچھ اور کھانے کو نہ ملے اور ڈر ہو کہ بھوک کی وجہ سے موت واقع ہو جائے گی۔ یہ اضطراری حالت قرآنِ مجید نے کہی ہے' اس کو خود اس نے تفصیل سے نہیں بتایا' ہر شخص اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی حد ہے جہاں پہنچ کر اضطراری حالت ہو سکتی ہے۔ اگر اضطراری حالت ہو جائے تو کہا ہے کہ یوں نہیں صاحب! ہم کھائیں گے' دیکھو کون ہمارا کیا کر لیتا ہے' ہم تو لذت کے لیے کھائیں گے' سرکشی کی بنا پہ کھائیں گے۔ کہا ہے کہ یہ کیفیت نہ ہو۔ اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں اتنے حصے تک (کہ موت واقع نہ ہونے پائے) ان حرام چیزوں کی بھی اجازت دی جا سکتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ان چیزوں کے حرام قرار دینے کے متعلق یہ اصول بیان کیا' یہ تصریح بیان کی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات پہ آیا ہے جہاں یہی چار چیزیں حرام ہیں اور یہی اس کے اندر استثنا ہے۔

اب یہ چیز کہ اس حلال و حرام کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے' غور فرمایئے کہ کس قدر' حتمی طور پر' یہ بات قرآنِ حمید نے کہی ہے کہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ (6:145) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا نے میری طرف جو وحی کی ہے' اس وحی میں' میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پا رہا۔ آپ نے غور کیا کہ کس قدر یقین سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ وہ پوری وحی جو میری طرف کی گئی ہے' اس میں صرف یہ چار چیزیں ہیں جن کو میں حرام پا رہا ہوں' ان کے علاوہ اور کوئی شے نہیں ہے جنہیں میں حرام پا رہا ہوں۔ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (6:145) وہی چار چیزیں ہیں یعنی جو بھی میری طرف وحی ہوا ہے' اسمیں ان کے سوا کسی اور چیز کو میں حرام پا ہی نہیں رہا' یہی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور جو شے بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے۔ آگے کہا ہے کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (6:145) وہی استثنا ہے کہ اگر اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس میں اتنی سی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ تم ان چیزوں میں سے کسی کو اس حد تک کھا سکتے ہو۔

چار چیزوں کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی شے کو حرام قرار نہیں دے سکتا

عزیزانِ من! یہاں یہ چیز یقین کے ساتھ کہہ دی گئی' صراحت کے ساتھ کہہ دی کہ خدا کی طرف سے جو وحی آئی ہے' اس میں یہی چیزیں حرام ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شے کو کسی کے

لیے حرام قرار دیدے۔ آپ دیکھیے کہ کس تھدی سے یہ کہا گیا ہے کہ: قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ (7:32) اے رسول! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لیے حلال قرار دیا ہے' خواہ وہ زینت کی چیزیں ہوں اور خواہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں۔ زینت و زیبائش کی چیزوں کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ جنہیں خدا نے حرام قرار نہیں دیا' قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ (7:32) کہہ دو کہ وہ کون ہے' وہ ذرا اٹھے بتائے' یہ کسے اختیار حاصل ہے کہ خدا جن چیزوں کو حلال قرار دے' وہ ان چیزوں کو حرام قرار دیدے' کسے یہ حق حاصل ہے! خواہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا زیب و زینت کی چیزیں ہوں' کون ہے جو انہیں حرام قرار دیتا ہے ؟ ابھی یہ بات سامنے آئے گی کہ خدا کے اس چیلنج کو کون قبول کر کے دھڑلے سے کہتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ کون ہے جو ایسا کہتا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ اس نے تو چار چیزیں کہیں جن میں تین طبعی ہیں جبکہ ہم نے وہ فہرستیں مرتب کی ہیں کہ اس کے اندر سینکڑوں شامل کر دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مَنۡ حَرَّمَ (7:32) انہیں کون حرام قرار دیتا ہے! یہ کہتے ہیں کہ ہم حرام قرار دیتے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ صاحبِ نبوت کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی اس قسم کی پابندی انسانوں پر عائد کرے۔

حلال چیزوں میں کسی چیز کا کھانا یا نہ کھانا ہر انسان کی مرضی پر منحصر ہے:

(66:1) میں آپ دیکھیے کہ خود ذات رسالت مآب ﷺ کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (66:1) اے نبی! جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے' تُو اپنے لیے بھی اسے کیوں حرام قرار دے رہا ہے۔ اس تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ بات تو قرآن کریم نے یہ کہی ہے کہ اور تو اور نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس نے دوسروں کے اوپر وہ پابندی نہیں عائد کی' اپنے لیے کسی چیز کے متعلق کوئی پابندی عائد کر لی کہ مثلاً میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز انسان کی اپنی مرضی پہ چھوڑی گئی ہے کہ حلال چیزوں میں کونسی چیز وہ کھائے' کونسی چیز نہ کھائے لیکن کسی چیز کو اس طرح سے ابدی طور پر اپنے اوپر حرام قرار دینا اور نبی کے اس طرح کے عمل کے نتائج بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کسی چیز کو محض اس لیے کہ طبیعت نہیں چاہتی' ناخوشگوار سمجھتی ہے' مزاج کے موافق نہیں ہے' پسند نہیں ہے' وہ اس چیز سے احتراز برتتا ہے' اجتناب برتتا ہے' نہیں کھاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس کی امت یہ سمجھ لے کہ یہ چیز تو ہے ہی حرام۔ اور اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا اس لیے قرآنِ کریم کو خاص طور پر یہ چیز کہنا پڑی' خود ذات رسالت مآب ﷺ سے یہ کہا گیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے تُو اسے اپنے لیے بھی حرام قرار کیوں دے رہا ہے' تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے نتائج کتنے دوررس ہونگے!

کسی چیز کو نہ کھانے کے سلسلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک واقعہ

جیسا میں نے ابھی عرض کیا اور پہلے بھی یہ بات ہو چکی تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسی طرح سے کوئی چیز ناپسند ہوگی'

انہوں نے اسے کھانا چھوڑ دیا۔ یہودیوں نے سمجھ لیا کہ یہ چیز حرام ہے۔ کہا ہے کہ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ (3:93) تمام چیزیں حلال تھیں بجز اس کے کہ حضرت یعقوبؑ نے خود اپنے لیے کسی ایک چیز کو چھوڑ دیا' اُسے کھانا چھوڑ دیا تو اس کے بعد بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ یہ چیز بھی حرام ہی ہوگی جو ہمارے نبی نے اسے کھانا چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے اوپر حرام قرار دیدیا۔ اس بنا پہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ خواہ آپ ﷺ نے اس چیز کو اس لیے چھوڑا ہو کہ یہ طبیعت پہ کچھ ناگوار گزرتی ہے آپ ﷺ اسے کھانا نہیں چاہتے لیکن آپ ﷺ کے اس عمل کا اثر بڑا دوررس ہوگا۔ اس سے پہلے ایسا ہو چکا ہے کہ ایک نبی نے محض اپنی طبیعت کی خاطر کسی چیز سے اجتناب کیا اور اس کی امت نے اسے حرام قرار دیدیا۔ کہا ہے کہ یہ چیز نہ کرو۔

> خدا کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ انسانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کردے جو ابدی پابندی بن کر رہ جائے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ خدا نے اس کے متعلق اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں تصریح کردی ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ حرام اور حلال کا مسئلہ' قرآنِ حکیم کی رو سے کتنا اہم ہے! وہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ انسانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کردے جو ابدی پابندی بن کر رہ جائے' یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ خدا نے اس کے متعلق اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں تصریح کردی ہے کہ کون کونسی چیز ابدی حرام' ہمیشہ کے لیے حرام' ہر حالت میں حرام' قرار دیدی بجز اس کے کہ اضطراری حالت کے لیے قرآنِ حکیم نے اس کے اندر کچھ Relaxation (رعایت) کردی۔ خدا نے ان چیزوں کی تصریح اپنی کتاب (قرآنِ مجید) میں کردی۔ تو دوسری چیز یہ ہوگئی کہ کتاب اللہ کے اندر جن چیزوں کے متعلق تصریح آ گئی ہے' خدا نے صرف انہیں حرام قرار دیا ہے۔ اگلی چیز یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہہ دیا گیا کہ آپ ﷺ کسی چیز کے لیے عادتاً بھی ایسا نہ کریں کہ مبادا بعد میں جو آنے والے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ شے بھی حرام کی فہرست میں داخل ہو جائے گی کیونکہ آپ ﷺ نے اسے نہیں کھایا۔ اور قرآنِ مجید نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ ہر جگہ یہی تین طبعی چیزیں ہیں: (1) مردار' (2) بہتا ہوا لہو' (3) لحم خنزیر اور چوتھی چیز عقیدے کی ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف جسے منسوب کیا جائے' وہ شے بھی حرام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز قرآنِ کریم کی رو سے حرام نہیں قرار دی گئی۔

حلال کے ساتھ طیّب کی شرط کا مقصد:

اب جنہیں قرآنِ کریم نے حلال قرار دیا ان کے متعلق ایسا نہیں کہ یہ ہر ایک کے اوپر فرض ہے کہ ہر حلال چیز کو ضرور کھایا جائے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم عجیب کتاب ہے۔ عام طور پر جہاں بھی حلال کا لفظ آیا' قرآنِ حکیم نے اس کے ساتھ طَيِّبًا کا لفظ کہا ہے۔ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوۡا مِمَّا فِى الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (2:168) جو کچھ بھی زمین پہ

سامانِ رزق ہے جسے حلال قرار دیا گیا ہے یعنی اس کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا' اس کے ساتھ یہ حَلٰلًا طَیِّبًا آیا ہے۔ یہ دوسری شرط ہے کہ اس حلال میں سے جو تمہیں پسند ہو' خوشگوار ہو' مزاج کے مطابق ہو' تکلیف نہ دیتا ہو' طیّب کے اندر یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں' انہیں کھاؤ۔ حلال میں سے بھی اب یہ تمہاری اپنی چوائس ہے' بعض چیزیں طبعاً کسی کے لیے' مزاج کے اعتبار سے' طبع کے اعتبار سے' نقصان دہ ہوتی ہیں' بعض چیزیں کسی کے ذوقِ لطیف پہ گراں گزرتی ہیں۔ وہ انہیں نہیں کھاتا' بعض چیزوں سے یونہی غیر شعوری طور پر نفرت سی ہو جاتی ہے اور بعض چیزوں کے نام سے کسی کو چڑ ہو جاتی ہے۔ آپ نے ایسے دیکھے ہونگے کہ ان کے سامنے کریلا کہیے تو وہ نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ کچھ چیزیں غیر شعوری طور پر بھی پیدا ہو جاتی ہیں' وہ طیّب نہیں رہتیں' حلال تو ہوتی ہیں مگر طیّب نہیں۔ اب یہ جتنی چیزیں حلال چیزوں میں سے ہیں یعنی جو قرآنِ مجید نے حرام قرار نہیں دیں' آپ دیکھیں گے کہ وہ لہو اور مردار جو ہے' وہ تو ہر ایک کے اوپر آ گیا یعنی ذبح کیا ہوا جو بکرا بھی ہے' بکرا بھی حلال ہے پھر آپ نے اس کو خدا کے نام پہ ذبح کیا وہ حلال ہوا' اس کا بھی جو بہتا لہو ہے' وہ حرام ہے۔ مردار کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

خنزیر کے متعلق یہ چیز' جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' چلی آ رہی ہے کہ اس کا تو نام بھی مسلمان نہیں سن سکتا لیکن اس کے علاوہ جتنی حلال چیزیں ہیں' ان حلال چیزوں میں سے آپ دیکھیے۔ ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا ہے (مثلاً) کتے کا نام لیجیے' ذہن میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ حلال ہے' اسی طرح یہ چھپکلیاں' یہ گرگٹ' یہ چوہیاں ہیں حالانکہ ہمارے ساتھ اور علاقے اور قومیں ہیں' وہ انہیں مزے لے لے کر کھاتی ہیں اور اس میں ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جو گھن والی چیز ہے وہ یہ کھا جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی ہندو بستا ہے' آپ کس مزے سے گائے کا گوشت کھا جاتے ہیں' وہ اتنی سی چیز پر نہ صرف یہ کہ اس کی طبیعت اِبا کرتی ہے بلکہ اس پر وہاں فساد ہوتے ہیں۔ اور انہی کے ہاں کا جینی تو کسی قسم کے گوشت کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ نان جینی ہندوؤں کے ہاں بھی یہ ویشو بھگت ہوتے ہیں' وہ سبزی کھاتے ہیں' گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں۔ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کسی قوم میں ایک عقیدے کا متوارث چلے آنا ہے کسی مسئلے کا چلے آنا ہے' اسی طرح تواتر سے کوئی روایت کسی معاشرے کے اندر چلی آتی ہے' روایت سے میرے معنی عام معاشرے کی پوزیشن ہے۔

حلال کے ساتھ طیّب ہونے کا تصور ہر جگہ مختلف ہوتا ہے اور طبعی ری ایکشن کا نتیجہ ہے

ہمارے گھروں کے اندر بچپن سے ہی ہر بچے کو معلوم ہے کہ چوہیا سے نفرت ہے' گرگٹ اور چھپکلیاں بلیاں اور کتے تو خیر کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ چیزیں چلی آ رہی ہیں' یہ ہمارے لیے طیّب نہیں رہیں' طبعاً ہمارے اندر سے ان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ طیّب نہیں رہیں۔ اب اگر کوئی یہ چیز کہے کہ صاحب! ٹھیک ہے کہ آپ نے تو کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' سنیے! میں نے نہیں کہا قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ یہ تین ہی طبعی چیزیں حرام ہیں' تو کیا یہ کتا

حلال ہے جی؟ اب کسی سے کہہ دیجیے کہ صاحب! کتا حلال ہے' پھر آپ دیکھیے کہ تماشہ کیا بنتا ہے کہ لو جی! ''او کتا وی حلال اے'' (کتا بھی حلال ہے)۔ پھر اگلا کہتا ہے کہ صاحب! حلال ہے' اسے کہو کہ ذرا اس کو کھائے۔ انہیں وہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے حلال کے ساتھ طیّب بھی کہا ہے۔ اب یہ حلال ہے مگر طیّب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی کوئی قوم کوہستان میں رہتی ہو' ان کے نزدیک یہ طیّب بھی ہو۔ وہ اگر قوم مسلمان ہو تو آپ کو اس کے لیے حق حاصل نہیں ہے کہ آپ انہیں کہیں کہ آپ کتا نہیں کھا سکتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں برا لگتا ہے۔ تمہیں لگتا ہوگا۔ تمہاری تو یہ بھی کیفیت ہوسکتی ہے کہ تم بینگن نہ کھاؤ۔ کیا آپ پڑوسی کو یہ کہہ دیتے ہو کہ صاحب! اپنے ہاں بینگن نہ پکایئے' ہمیں تو اس کی بو آ جائے تو اُبکائی آ جاتی ہے۔ آپ نے غور کیا کہ کسی چیز کے حلال ہونے میں اور طیّب ہونے میں کیا فرق ہے اور اس کے طیّب نہ ہونے میں اور حرام ہونے میں کیا فرق ہے۔ جس جس قوم میں کوئی چیز طیّب ہے اور قرآنِ کریم نے حرام قرار نہیں دیا' وہ مسلمان ہو کر بھی اس چیز کو کھا سکتی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں' کسی قوم پہ کوئی ایسا وقت آ کر پڑے۔ یہ گھوڑے کا' گدھے کا گوشت عام طور پر ہم نہیں کھاتے البتہ جنگ کے زمانے میں جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہاں اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ خچریں ذبح کی جاتی ہیں' گھوڑوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قوم میں ایسا وقت آ جائے اور ایک نسل اس کو کھانا شروع کر دے تو جو اگلی نسل ہے اس کے نزدیک یہ چیز طیّب ہو جائے گی۔ یہ طیّب و ناطیّب ہونا جو ہے' خوشگواری اور ناخوشگواری ہونا جو ہے' یہ تو انسان کا طبعی ری ایکشن ہے۔ یہاں طبعی ری ایکشن کا سوال نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے کتنی بڑی رعایت برتی ہے۔ حرام قطعی تو صرف یہی چیزیں قرار دی ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو اور خنزیر۔ عقیدے کی چیز میں نے الگ بیان کی ہے یہ ہر حلال چیز ہے جس پہ خدا کے علاوہ کسی کا نام لیا گیا ہو' وہ تو آپ کہیں گے کہ یہ بار بار کیوں دہرا رہا ہے' آپ کی طبیعت میں بھی آتا ہوگا کہ صاحب! روز کھاتے ہیں' ابھی جا کر کھانی ہے' محلے میں دیگ پک رہی ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسے بار بار کہے جا رہا ہے' کہے جا رہا ہے لیکن وہ کیا کیا جائے یہاں قرآنِ کریم میں حرام آیا ہے۔ تین طبعی چیزیں وہ ہیں اور چوتھی یہ عقیدے کی چیز ہے جو اس نے حرام قرار دی ہے۔ یہ چیزیں جو ہیں تو یہ تو ابدی طور پر حرام ہوگئیں بجز اس کے جس میں قرآنِ حکیم نے Relaxation (رعایت) کی اضطراری حالت میں اجازت دی۔ یہ تو ابدی ہوگئیں ہر زمانے میں ہر قوم میں ہر ملک میں ہر فرد کے لیے۔ باقی چیزیں جتنی بھی ہیں وہ حرام نہیں ہیں' وہ حلال ہیں' ان میں سے جس جس کو کوئی فرد' کوئی قوم' کوئی گروہ' کوئی ملک' اپنے لیے طیّب سمجھتا ہے وہ اسے کھائے اور اگر طیّب نہیں سمجھتا تو پھر بالکل نہ کھائے۔

آنے والے دور میں حلال اور طیّب کی وسعت اور تقاضے:

عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن کریم نے حلت اور حرمت کے متعلق بیان کیا ہے۔ کتنی عظیم چیز ہے جو اس نے بیان کر دی

ہے! اتنی کھلی ہوئی گنجائش ہے جو اس نے دیدی۔ ابھی تو ان چیزوں کے متعلق اس کی اہمیت ہمارے ذہن میں نہیں ہے کہ قرآنِ مجید نے جو اس طرح سے حلال کی رسیاں کھولی ہیں' یہ انسانیت پر کتنا بڑا احسان ہے' کل کو اس کے متعلق پتہ چلے گا۔ بہت سی ایسی چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہیں شاید ختم ہوتی چلی جائیں کہ جو عام طور پہ کھائی جاتی ہیں' اس کے بعد انسانوں کے لیے کھانے پینے کے لیے یہ چیزیں باقی نہیں رہیں گی۔ وہ چیزیں باقی رہیں گی جنہیں آج ہم نہیں کھاتے' باقی قومیں جنہوں نے اپنے اوپر پابندیاں عائد نہیں کیں' وہ تو آسانی سے ان چیزوں کو کھائیں گی۔ یہ گدھے ہونگے' یہ گھوڑے ہونگے' یہ کتے ہونگے' یہ تمام چیزیں ہونگی۔ اگر آپ نے اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کیں یا خدا کی طرف سے یہ سب پابندیاں عائد ہوگئی ہوتیں تو اتنی سی چیزیں جو ختم ہوجاتیں اس کے بعد کچھ کھانے کو ہی نہیں مل سکتا تھا۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ چیزیں اگر اضطراری حالت میں بھی کسی پر ختم ہوگئیں اور وہی کھانی پڑیں جو ہم نہیں کھاتے' اس لیے کہ وہ ہمارے نزدیک طیّب نہیں ہیں' اگر کسی مجبوری کے عالم میں بھی وہ چیزیں ہمیں کھانی پڑیں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ان سے وہ ناگواریت اور نفرت ہے' وہ جذبہ مٹ جائے تو وہ طیّب میں آجائے گی لیکن جن قوموں نے ان چیزوں کو اپنے اوپر ابدی طور پر حرام قرار دیا ہوا ہے آپ ان کی مشکلات سوچیے۔ گوشت نہیں کھانا' ایسے مقامات میں وہ چلے جائیں جہاں سبزیاں نہیں ہوں' یہ بحر منجمد شمالی وغیرہ کے اندر جہاں برف ہی برف ہوتی ہے' صحراؤں کے اندر' سمندر میں گزارا کرنا پڑے مہینوں تک برسوں تک' کیا کیا جائے گا وہاں؟ وہاں پتہ چلے گا کہ یہ صرف دو تین چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی کو جو حلال قرار دینا ہے یہ انسانیت کے لیے کتنی بڑی منفعت بخش چیز ہے۔

حرام وحلال کے سلسلہ میں ہمارے وضع کردہ فقروں کی نوعیت:

عزیزانِ من! یہ تو قرآنِ کریم نے کیا ہے۔ اب اس کے بعد اسے چھوڑیئے کہ آپ طبعاً کن چیزوں کو ناگوار سمجھتے ہیں۔ اب آپ اپنے ہاں کے مفتیانِ کرام سے پوچھیے۔ وہ حرام کی اتنی اتنی لمبی فہرستیں آپ کو بتائیں گے کہ آپ حیران ہوجائیں گے کہ پھر حلال کیا رہا۔ آپ کے ہاں فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہوچکی ہیں جن میں درج ہے کہ یہ بھی حرام' یہ بھی حرام' یہ بھی حرام۔ اور پھر بعض چیزوں کے اوپر بحثیں چلی آرہی ہیں۔ آپ کے ہاں ہزار برس سے کو احلال ہے یا حرام ہے' اس پر اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ فہرستوں کی فہرستیں مرتب ہوئی ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا جو میں نے ابھی کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) اے رسول! پوچھو ان سے کہ کون ہے وہ جو یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں جنہیں خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ یہ ہیں ہمارے ہاں شریعت کے وہ ارباب جو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر' بجا کر' کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو ان چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہاں قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) میں قرآنِ حکیم نے دونوں چیزیں کہی تھیں: زینت کی چیزیں بھی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ اب ہمارے ہاں ان فہرستوں میں یہ ہے کہ ریشم پہننا حرام ہے' چاندی سونے کا زیور پہننا حرام

ہے۔اس سے ایک فائدہ تو ہوجائے گا۔جنت میں ریشم کے کپڑے ہیں' چاندی سونے کے برتن ہیں ''اے سارے فیر اوتھے آپ حرام کھان گے'' (یہ تمام پھر وہاں حرام کھائیں گے)۔دراصل انہوں نے یہ سب کچھ اپنے آپ پہ خود ہی حرام قرار دے لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جنت تو وہاں ہوگی جہاں یہ نہ ہوں ورنہ ''اوتھے وی جا کے رولا پادین گے'' (یہ وہاں بھی جا کر خوب گھپلا کریں گے' شور شرابا کریں گے)۔یعنی وہاں جنت میں سبزیوں کا ذکر نہیں ہے' اناج کا بھی ذکر نہیں ہے' گوشت ہی گوشت کا ذکر ہے۔دیکھیے! قرآنِ حکیم وہاں ریشم کے مختلف قسم کے لباس کا کہتا ہے جس میں حریر و اطلس بھی ہے' اس کے اندر ریشم بھی ہے' ایسے ایسے ریشمی کپڑے ہیں جو دبیز ریشم کے ہیں اور وہ باریک ریشم کے بھی ہیں۔اس قسم کی چیزیں قرآنِ مجید گناتا چلا جاتا ہے۔اور یہ کنڑ [1] بلوری اور چاندی اور سونے کے زیورات تو وہاں جنت میں ایک طرف رہے' وہ برتن بھی وہاں چاندی اور سونے کے گنا رہا ہے۔جبکہ یہاں ان کا استعمال تک حرام قرار دیا جا رہا ہے۔''میرا خیال ہیگا اے کہ ایناں اوتھے جا کے فتویٰ وی بدل لینا ہیگا'' (میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہاں جا کر اپنا فتویٰ بھی بدل لینا ہے)۔میں کہہ یہ رہا تھا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ کہو' کون ہے جس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان زینت کی چیزوں کو اور کھانے پینے کی چیزوں کو حرام قرار دیدے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس جاری کردہ فتوے

عزیزانِ من! سوچیئے تو سہی کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہوئے ہیں۔فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں آپ کے ہاں حرام اور حلال کی۔ اسے آپ کے ہاں فقہ کہا جاتا ہے۔قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ خدا نے وحی کیا ہے' اس میں تو میں ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پاتا اور خدا نے کہا تھا کہ ان سے پوچھو پھر کون ہے جو ان چیزوں کو حرام قرار دے۔یہ اس دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں حرام قرار دی ہیں۔یہ ''حرام قرار'' دینے کے درس کی بات شروع ہوئی تھی' یہ کہاں سے یہ چیزیں حرام قرار دی گئیں؟

خودساختہ فتوؤں کے باعث امت پر وارد ہونے والا عذاب

کہا ہے کہ: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ (4:160)۔ان کے جرائم کی سزا میں یہ چیز کی گئی تھی کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔یہ جو آپ کے اوپر' امتِ مسلمہ کے اوپر' مسلمانوں کے اوپر' یہ اتنی فہرستوں کی فہرستیں ہیں جو ان چیزوں کی ہیں جو حرام قرار دیدی گئی ہیں یہ بھی تو اس امت کے جرم کی سزا میں ہی کچھ ہوسکتا ہے۔یہ سزا ہے جو اس امت کے اوپر وارد ہوئی ہے ورنہ قرآنِ کریم نے تو تاکید کی تھی کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (5:87) اے ایمان والو! لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (5:87) خدا نے جن چیزوں کو تمہارے لیے حلال طیّب قرار دیا ہے انہیں حرام نہ قرار دے لینا

[1] کنڑ۔یہ انگریزی لفظ Deconter کا مہتد ہے' واحد اور مذکر ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنا تاکیدی حکم ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَلَا تَعْتَدُوْا (5:87) جو حد سے گزر جانے والی بات ہوگی وہ نہ کرنا۔ حدیں ہم نے مقرر کی ہیں بس یہ ہے لائن' اس سے تجاوز نہ کرنا۔ عزیزانِ من! ان چیزوں کے اندر کسی ایک چیز کا بھی جو اضافہ ہے' خدا کی جو لگائی ہوئی حد ہے' وہ اس سے تجاوز ہے۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ لَا تُحَرِّمُوْا (5:87) جنہیں ہم نے حلال قرار دیا ہے' انہیں تم حرام نہ قرار دے لینا۔ اور اس کے بعد اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس قسم کے لوگ بھی ہیں جو فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114)۔ یہاں پھر وہی الفاظ آئے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور تم ان کو نعمت سمجھتے ہو' وہ طیّب ہیں' ان میں سے انہیں کھاؤ پیو اور خدا کے سپاس گزار رہو کہ اس نے خواہ مخواہ تمہارے اوپر پابندیاں نہیں عائد کر دیں۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ کہا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ محکومی اور غلامی صرف خدا کی ہو سکتی ہے' کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ کہا ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16:114)۔ قرآن کریم اس کو شرط قرار دیتا ہے کہ یہ چیز وہی سمجھ سکے گا' وہی اس کو Appreciate (پسند) کر سکے گا جو یہ مانے کہ بندوں کو' انسانوں کو' کسی کے اوپر پابندیاں عائد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے۔ اگر تم صرف اس کی عبودیت اختیار کیے ہوئے ہو تو جو چیز ہم نے حلال قرار دی ہے' اسے حرام نہ قرار دے لینا۔ آگے کہا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (16:115)۔ یہ وہی الفاظ ہیں۔ پھر سن لو کہ حرام یہ چیزیں ہیں: مردار' بہتا ہوا لہو' لحم خنزیر اور خدا کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کردہ چیزیں۔ یہ ہیں حرام۔

قرآنِ حکیم کے مقرر کردہ قوانین میں ردوبدل کرنا خدا پر افترا ہو جائے گا

آگے کہا ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (16:116) کہتا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے' زبان درازیوں سے' چکنی چپڑی باتیں کرتے کرتے' یہاں تک نہ پہنچ جاؤ کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ وہ تو ہم نے بتا دیا کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ کہا ہے کہ یونہی بیٹھے ہوئے اپنی چرب زبانی کے اعتبار سے جھوٹ بولتے ہوئے' فہرستیں نہ مرتب کرنے لگ جانا۔ اور لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (16:116) انہیں خود حرام قرار دو اور ان کو شریعتِ خداوندی بنا کر لوگوں کے اندر رائج کرو' یہ خدا کے اوپر افترا ہو جائے گا' ایسا نہ کر دینا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (16:116) یاد رکھو! خدا کے خلاف جو افترا بازی ہے' اس کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ کرنے لگ جانا۔ عزیزانِ من! دیکھیے تو سہی کہ اس قوم میں اس قرآنِ مجید کی تلاوت کتنی ہوتی ہے! ان کے ہاں تلاوت کے معنی صرف اس کا پڑھنا ہے حالانکہ عربی زبان میں تلاوت کے معنی ''پیروی کرنا'' ہوتا ہے۔ اس کی تلاوت کتنی ہوتی ہے اور ہمارا عمل اس کے خلاف کس قدر ہے! چھوٹی چھوٹی چیزیں تو ایک طرف رہیں' حلت و حرمت کے متعلق' حرام و حلال کے متعلق ہماری کیا کیفیت

ہے! جن چیزوں کو بالفاظ صریح قرآنِ حمید نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرنا لیکن ہم نے ان چیزوں کو شریعت مقدسہ بنایا ہوا ہے۔

حرام چیزوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی شریعت کا عمل دخل جو سراسر احکامِ قرآنی کے منافی ہے

ہم نے درس کی ابتدا اس آیت سے کی تھی کہ یہودیوں پر یہ چیزیں یعنی ناخن دار پرندے اور گائے اور بکری کی چربی ان کے جرائم کی وجہ سے حرام قرار دی گئی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہ جو شریعت حقہ بیان کی جاتی ہے' اس میں بھی سارے ناخن دار پرندے حرام ہیں۔ آپ کے اربابِ شریعت کی فہرستوں کے اعتبار سے اس قسم کی چونچ جیسی طوطے کی ہوتی ہے یا جن پرندوں کے پنجوں میں ناخن ہوتے ہیں حرام ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ یہودیوں پہ دس چیزیں ان کے جرائم کی بنا پر حرام قرار دی گئی تھیں اور ان میں بتایا یہ تھا کہ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (6:146) یہ جتنے ناخن دار پرندے ہیں' یہ حرام قرار دیئے تھے جو ہم نے ان کو ان کے جرم کی بنا پر سزا دی تھی۔ آپ نے یہ سب اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہیں۔ انہیں تو جرائم کی سزا میں یہ چیزیں حرام ہوئی تھیں' آپ نے از خود اپنے اوپر یہ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ یہ ہے تماشا۔ قرآنِ حکیم تصریح کر رہا ہے کہ ہم نے ان کو ان کے جرائم کی بنا پہ یہ چیز بطور سزا دی تھی لیکن ہمارے لیے اس نے حلال قرار دیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب! ''تے ساڈے بھرا لگدے ہیگے نیں او' نال ای اوناں دے اسی وی حرام کر لیا کہ ساہنوں سزا کیوں نئیں ملدی پئی'' (ہمارے بھائی لگتے ہیں تو ہم نے ان کے ساتھ یہ حرام قرار دے لیا کہ ہمیں سزا کیوں نہیں مل رہی)۔ ہم نے از خود اپنے اوپر ان سزاؤں کو وارد کر لیا ہے۔

بیان کردہ چار چیزوں کو حرام قرار دینے کی وجہ جواز:

اب وہ سوال باقی رہ جاتا ہے جو عام طور پہ کیا جاتا ہے کہ صاحب! قرآنِ مجید نے یہ چیزیں حرام کیوں قرار دیں۔ یاد رکھیے! بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' خود قرآنِ حکیم نے بتا دیا ہے' بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ''کیوں'' جو ہے' وہ انسانی بصیرت' علم تجربہ مشاہدہ مطالعہ کے اوپر منحصر ہے کہ وہ ان کی بنا پر اس چیز کو پرکھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ حرام ہیں' یعنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں آئے تو حرام ہیں اور وجہ سمجھ میں نہ آئے یا ہم کہہ دیں کہ نہیں صاحب! اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے' یہ حلال ہو جائے۔ وہ تو طیّب چیز جو حلال میں سے ہے' اس میں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس نے جسے حرام قرار دیا ہے' اس میں یہ صورت نہیں ہے' وہ بہر حال حرام ہے۔

''کیوں'' کی بات کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ڈاکٹرز' غذائیات کے متعلق جنہوں نے تحقیقات کی ہیں' وہ اپنے نقطۂ خیال سے ان چیزوں کے متعلق کچھ آپ کو بتائیں۔ سائیکولوجسٹ (ماہر نفسیات)' سوشیالوجسٹ (ماہرِ سماجیات)' انتھروپالوجسٹ (ماہر بشریات) اپنے اپنے علمی نقطۂ نگاہ سے ان چیزوں کے متعلق کچھ بیان کریں لیکن ایک چیز ایسی ہے جو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کیا تھی۔ پوری انسانیت کی تاریخ آپ دیکھیں۔ جب سے وہ ہمارے

سامنے آئی ہے' وہ کسی ملک کی تاریخ ہو' کسی قوم کی تاریخ ہو' اس میں آپ دیکھیں گے کہ مردار خور' خون پینے والا' خون آشام' یہ الفاظ دنیا کی ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زمانے میں' تاریخ کے ہر دور میں' بڑی قابلِ نفرت قرار دی گئی ہیں یعنی ان چیزوں کے خلاف ایک عالمگیر نفرت ہے۔ کسی کو آج کہہ دیا کہ یہ خون پینے والا ہے' یہ جو خون پینا ہے' یہ بڑا ہی قابلِ نفرت قرار پاتا ہے ۔اور جو مردار خور ہے' آپ دیکھیے سوائے ان قبائل کے جو بالکل ہی وحشت اور درندگی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہوں' ان میں یہ چیزیں رائج ہوتی ہیں لیکن جہاں بھی انسان ذرا تمدن اور تہذیب کے دائرے میں آیا ہے' وہاں آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے' کسی زبان کا لٹریچر اٹھا کر دیکھیے' اس کے اندر یہ چیزیں ہمیشہ نفرت کے پہلو میں بیان کی جائیں گی' محاورے ہونگے' تمثیلات ہونگی' تشبیہات ہونگی۔ باقی رہا یہ خنزیر تو اس کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ''کیوں'' حرام ہے لیکن ہمارے ہاں انسانیت کی تاریخ کسی قوم کے بارے میں پہلے صفحے ہی پر خنزیر کو ہمیشہ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ آج بھی یورپ کی یہ اقوام جو مزے لے لے کر کھاتی ہیں' وہیں ٹیبل پہ بیٹھے ہوئے اس کا گوشت کھا رہی ہیں اور گالی پھر بھی اس کو دے رہی ہیں اور منہ میں اس کا ٹکڑا بھی ہوتا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے ان کے ہاں بھی یہ چیز گالی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو یہ تھا ہی حرام۔ عیسائیوں کے ہاں بھی حضرت عیسٰیؑ نے کہا ہے کہ میں تو جو شریعتِ موسوی ہے' اسی کو زندہ کرنے کے لیے آیا ہوں عیسائیوں کے ہاں بھی یہ حرام تھا۔

یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی وجہ جواز

یہودیوں سے نفرت' دشمنی اور انتقام کی بنا پر یہ ایک عجیب المیہ ہوا تھا' یاد رکھیے! عیسائیوں کے یہودیوں کے خلاف بڑے ہی انتقام اور نفرت کے جذبات تھے اس لیے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم نے عیسٰیؑ کو صلیب کیا تھا' ایک تو مریمؑ پر انہوں نے تہمتیں باندھی تھیں' حضرت عیسٰیؑ کے متعلق یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے ان کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مارا ہے' عیسائی تو ان کے جانی دشمن تھے۔ عیسائیوں میں ایک گروہ پیدا ہوا' جنہوں نے کہا کہ جو چیز یہودیوں کے ہاں ہوتی ہے' علی الرغم ہم اس کی مخالفت کریں گے' یہودیوں کے ہاں ختنہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا' انہوں نے اس کو چھوڑا۔ عیسائیوں کے ہاں شروع میں حضرت عیسٰیؑ جس مسلک کے تھے' اس میں ختنہ بھی ضروری تھا' وہی بنی اسرائیل کی جو رسم تھی اس کے اوپر وہ پابند تھے۔ اور ان کے ہاں یہ سور بھی حرام تھا' ان لوگوں نے یہ جو دو چیزیں تھیں ان دونوں کو یہودیوں کے علی الرغم ان سے انتقام کی وجہ سے اپنے ہاں جائز قرار دیا۔ یوں ان کے ہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی اور جب کہیں سے ابتدا ہوئی تو پھر بات آگے چل نکلی' پھر وہ قوم مذہب کی بنا پر ان سے Indifferent (لاتعلق) ہو گئی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں یہ چیزیں جائز قرار پا گئیں ورنہ ان کے لیے بھی سور حرام ہی قرار دیا گیا تھا۔ اور میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ گوشت کھانے کی حد تک تو انہوں نے یہ جائز قرار دے لیا' گالی اب بھی سور کی دی جاتی ہے اور انجیل میں تو یہ گالی ہے ہی کہ ''موتیوں کو سوروں کے آگے تو نہ ڈال دو''

وہاں قابل نفرت انسانوں کو سور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ جو انسانیت کا عالمگیر جذبہ ان چیزوں کے خلاف چلا آ رہا تھا' میں نے کہا ہے کہ بعض چیزیں تو لوکل ہیں مثلاً ہمارے ہاں چھپکلی' مینڈک یا چوہیا وغیرہ جو ہیں' ان سے نفرت ہے' ساتھ ہی ہمارے دوسری قومیں ہیں' جن کو نفرت نہیں ہے۔ ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں' ساتھ ہی ہندو ہے' انہیں گائے کے گوشت سے نفرت ہے' وہ اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن یہ سور ایسی چیز ہے جس کے متعلق عالمگیر انسانیت میں شروع سے نفرت پائی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر انسانیت کے جذبات کی قدر و منزلت کا مقام:

میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حکیم نے عالمگیر انسانیت کے ان جذبات کا احترام کیا کہ جس کے خلاف طبع Revolt (بغاوت) کرتی ہو' اِبا کرتی ہو' اسے قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا۔ اور جسے آپ اقدار مشترک کہیں گے' ایسی چیزیں جو ہر جگہ' ہر زمانے میں' ہر قوم میں' مشترکاً قابل نفرت پائی جاتی ہیں یہ ان کے متعلق قرآنِ حکیم نے کہا ہے۔

باہمی رشتہ داری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت

میں نے کہا ہے کہ دیگر زاویوں سے جو اس کے متعلق تحقیق کریں گے وہ آپ کو اپنی اپنی نگاہ کی چیزیں بتائیں گے' یہ ان کا احاطہ ہوگا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس نے ماں اور بہن اور بیٹی کے رشتوں کے متعلق نکاح حرام قرار دیا ہے' انہیں اگر آپ پوچھیں تو ہوسکتا ہے کہ ہم شاید Biologically (حیاتیاتی لحاظ سے) اس کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض قوموں کے اندر یہ جو Cousin ہیں' یہ چچا کی لڑکی ماموں کی لڑکی' ان کے آپس کے رشتوں کو مقامی طور پر حرام قرار دیا تھا' یہ عالمگیر بات نہیں تھی۔ عالمگیر انسانیت میں آپ دیکھیں گے کہ ماں بہن بیٹی وغیرہ جو ہیں ان میں یہ نکاح حرام چلے آ رہے ہیں۔ ان کی ابتدا کیسے ہوئی' کیوں یہ ہوا' ابھی تک تو اس کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ یہ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ ان تمام عقائد کو جو ابتدا سے انسانوں کے اندر چلے آ رہے ہیں وہ دیکھیں کہ یہ کیسے پیدا ہوئے تھے' کیا حالات تھے لیکن تاریخ میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو پوری عالمگیر انسانیت کے اندر بطور مشترک قدر کے چلی آ رہی ہیں' یہ ان چیزوں میں سے ہیں' ان میں استثنا تھا کہ جیسے یہ چیزیں جو حرام قرار دی ہیں' ایسے ہیں' ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو اس قسم کی چیزیں کھا جاتے ہیں۔

بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ نکاح کے معاملہ میں رومنز اور ایرانیوں کے ہاں استثنا کا معاملہ پایا جاتا تھا

اسی طرح سے نکاح کے معاملے میں بھی ایسی استثنا پائی جاتی تھی۔ رومنز (رومیوں) کے ہاں بھی یہ کیفیت تھی کہ بیٹی سے شادی کر لیتے تھے' ایرانیوں کے ہاں بیٹیوں بہنوں سے شادی کر لیتے تھے' ان میں استثنا تھی کہ صرف Royal Family (شاہی خاندان) والے کر سکتے تھے' بادشاہ کر سکتا تھا' عوام میں یہ اجازت نہیں تھی لیکن عالمگیر انسانیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کو شروع سے ہی حرام قرار دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو رشتے حرام ہیں' یہ احترام کی وجہ سے ہیں' نفرت کی وجہ سے نہیں ہیں لیکن کسی وجہ سے بھی ہوں' یہ عالمگیر چیز تھی۔ میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس چیز کو حرام قرار

دیا ہے' تحقیق کے بعد اور وجوہات بھی اس کی نکلیں گی یہ چار چیزیں ہیں جنہیں قرآن مجید نے حرام قرار دیدیا ہے' وہ بجز ان حالات کے جیسے اس نے کہا ہے کہ اضطراری حالت میں اس کی اجازت ہے اور کسی صورت میں وہ جائز قرار نہیں پا سکتیں۔ جنہیں حلال قرار دیا ہے ان حلال میں سے آپ کے مزاج طبیعت اور ذوق پر منحصر ہے' جسے آپ اچھا سمجھیں' خوشگوار سمجھیں' طبع کے مطابق سمجھیں' اسے استعمال کریں' اسے کھائیں پئیں اور جسے آپ پسند نہ کریں اسے چھوڑ دیں۔

رشتوں کے معاملہ میں قرآن حکیم کا ابدی اصول:

رشتوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ کہا ہے کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) جن سے نکاح حلال ہے' جائز ہے' ان میں سے بھی اپنی طبیعت' انتخاب' پسند خوشگواری سے لاؤ۔ یہ انتخاب دونوں کے لیے ہے' مرد کے لیے بھی یہ چیز ہے کہ عورتوں میں سے جو طیّب ہوں ان میں سے لاؤ' عورتوں کے متعلق بھی یہ ہے لیکن آگے جا کر کہا ہے کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) یہ قطعاً حلال نہیں ہے کہ تم عورت کی مرضی کے خلاف اس کو مجبوراً اپنے نکاح میں لے آؤ' اُس کے لیے بھی انتخاب کا حق ہے' وہاں بھی حلال کے ساتھ طیّب ہونا قرآنِ کریم نے قرار دیا ہے۔ اس لیے جو حلال ہے اس کا طیّب ہونا ضروری ہے' جو آپ کے لیے طیّب نہیں ہے' آپ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ جسے اس نے حرام قرار دیا ہے' اسے آپ حلال نہیں قرار دے سکتے اور جسے حلال قرار دیا ہے' ناخوشگواری کی بنا پر اسے آپ اپنے لیے چھوڑ سکتے ہیں' اسے حرام نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ہے جو آپ کے ہاں غلط ہوا کہ اس کا حق قرآنِ حکیم نے اپنے سوا کسی اور کو نہیں دیا۔

یہودیوں کے متعلق ذکر ہو رہا تھا' یہ تاریخ میں ذلیل ترین قوم چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ حکیم نے وہ جرائم گنائے ہیں جن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہا ہے کہ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (4:160) عزیزانِ من! بہت بڑا جرم یہ تھا کہ خدا کے راستے سے روکتے تھے' وہ لوگوں کو خدا سے روکنے کے لیے روک بن جاتے تھے۔

امریکا اور یورپ کے اہل دانش اور پادریوں کے استفسارات کی نوعیت اور ہماری حالتِ زار کے پیش نظر ان کا اعتراض

یہ روک بن جانا کیا چیز ہے؟ وہ کیسے روک بنتے تھے' اسے چھوڑیئے' ہم آج کیسے روک بن رہے ہیں اس کا تجربہ تو آپ کو بھی ہوتا ہو گا اور مجھے تو اکثر اسکا تجربہ ہوتا ہے۔ امریکا اور یورپ کے اکثر مفکرین' فلاسفرز' سائنٹسٹ میرے پاس آتے ہیں' وہ مجھ سے متعارف ہیں کہ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے یہ بھی اس معاملے میں کچھ فرق رکھتا ہے۔ میں تو اسلام کو قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کرتا ہوں' علم و بصیرت کی رو سے اس کی تائیدات پیش کرتا ہوں۔ میں اس میں بلا استثنا عرض کروں گا اور اس میں ان کے ہاں اچھے اچھے بڑے بڑے پادری بھی شامل ہیں۔ لمبی چوڑی دنوں کی نشست نہیں ایک ہی نشست میں تھوڑے سے وقت کے اندر اس کی صداقت پہ وہ قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر قرآنِ حمید کا دعویٰ

ہے کہ یہ انسانیت کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے تو آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی ایسی ذلیل حالت کیوں ہے؟ اس کا کوئی جواب ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہم کس طرح خدا کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔ اگر ہم آج دنیا کے سامنے نہ ہوں' ایسی ذلیل وخوار قوم' جو اپنی روٹی تک کے لیے ان کے دروازوں پر جھولیاں پھیلانے کے لیے مجبور ہے' جنہیں یہ کافر اور ملحد اور بے دین کہہ رہی ہے' اور یہ اسلام کی مدعی ہے۔ وہ ہماری حالت کو دیکھ کر اس طرف آتے ہی نہیں' وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تمہارے ہاں یہ اس قدر شفا بخش نسخہ ہے تو تم اس قدر ان مرضوں کے اندر کیوں مبتلا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کوئی ڈاکٹر بھی دیکھیں جو تپ دق کا مارا ہوا کھانستا ہے' زرد رنگ کا ہے' ہڈیاں نکل رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے کہ تپ دق کے مریضو! میرے پاس آؤ' میرا نسخہ آزما کے دیکھو' چند دنوں کے اندر اندر ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ارے! نسخہ تمہارے پاس ہے تو تم خود اچھے کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہ قرآنِ حکیم کی تعلیم' یہ اسلام کے اتنے بلند اصول' نظری طور پر اگر آپ لوگوں کو سمجھائیے تو اقوام عالم سمجھتی ہیں اور اس کے بعد وہ یہ کہتی ہیں کہ پھر تمہاری حالت ایسی کیوں ہے' اگر فی الواقعہ یہ اس قابل ہے تو تمہیں کیوں یہ شفا نہیں دیتا۔ اور پھر آج کی حالت نہیں ہے' صدیوں سے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اب یہ چیز کہے جانا کہ صاحب! ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے تو اس واسطے ایسا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب تم خود اس کے مدعی ہو کہ اس میں اتنی منفعت بخش چیزیں ہیں تو تمہیں اپنا نفع نقصان بھی یاد نہیں آتا یعنی کونسی وجہ ہے جو تمہیں مجبور کر رہی ہے کہ اتنی منفعت بخش چیز کو چھوڑ کر' اتنی ذلت آمیز حالت تم نے اختیار کر رکھی ہے' عجیب قوم ہو تم۔ وہ اس کو باور نہیں کرتے۔ آہستہ آہستہ کیفیت ہماری بھی یہ ہو گئی ہے۔

ہماری نئی نسل میں پیدا ہونے والی مایوسی اور خدا کے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان

عزیزانِ من! ہماری اگلی نسل میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ کسی زمانے میں' چودہ سو سال ہوئے' تھوڑے عرصے کے لیے' اس نے حرکت پیدا کی تھی اور عربی قوم نے یہ کچھ حاصل کر لیا تھا لیکن اب یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو زندگی اور سرفرازی عطا کر سکے۔ خود اسلام کی طرف سے ہماری آنے والی نسل مایوس ہو رہی ہے۔ یہ ہے خدا کے راستے میں کھڑے ہو جانا' حائل ہو جانا۔ عزیزانِ من! غیروں کو دعوت دینا تو ایک طرف رہا' ہماری اپنی آئندہ نسل آگے نہیں بڑھ رہی' ہمیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ آپ کی ساری تاریخ ان چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ کیا جواب دے سکتے ہیں آپ ان کو سوائے اس کے کہ وہ جواب جو حضور سرورِ کائنات ﷺ نے دیا جو قرآنِ کریم نے بات مھجورا بیان کی ہے کہ قیامت میں جب اس قسم کی یہ ذلیل وخوار قوم آئے گی' قرآنِ مجید کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے ماننے والے دنیا میں اعلون ہونگے اور یہ ذلتوں اور خواریوں کے پیکر جب وہاں سے آئیں گے تو یہ اس قوم کو گزرتے ہوئے' یوں قرآنِ حکیم نے ایک انداز میں بات کی ہے' رسول اللہ ﷺ خدا سے کہیں گے کہ یا اللہ! یہ ہے وہ قوم جس نے قرآنِ

حکیم کو چھوڑ دیا تھا۔ تو مصیبت یہ ہے ہماری منافقت کی کہ ہم اس کا بھی تو اعتراف نہیں کرتے کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ آج بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کتاب اتنی زیادہ نہیں پڑھی جاتی' جتنا قرآنِ حمید پڑھا جاتا ہے۔ اس قرآنِ حمید کے متعلق کہیں سے ذرا بے حرمتی کی آواز آتی ہے تو کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ فلاں جگہ صاحب! قرآنِ حمید کے ورق پھاڑ دیئے' فلاں جگہ کسی نے قرآنِ کریم کی ایک سطر جلا دی' قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اور کیفیت ہماری یہ ہے کہ اس کی صداقتوں کے راستوں میں ہم حائل ہیں۔

قرآنی حقائق کو عملی شکل دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا معاشی نظام ہے:

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا (4:160) اور یہ لوگ ہمیشہ نظامِ خداوندی کی راہ میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور حائل ہونے کی سب سے بڑی وجہ جو قرآنِ کریم نے کہی ہے وہ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا (4:161) ہے۔ انہوں نے ایسا معاشی نظام قائم کر رکھا ہے کہ جس میں سرمایہ روپے کو کما کر لاتا ہے' اس میں معاوضہ محنت کا نہیں' سرمائے کا ہوتا ہے۔ ربٰو کے معنی یہ ہیں۔ ربٰو کے متعلق تو بہت دفعہ یہ چیزیں آ چکی ہیں یعنی سو روپیہ آپ کے ہاں بکس میں رکھا ہوا ہے' دس دن رکھا رہے' دس برس رکھا رہے' سو برس رکھا رہے' جب نکالو گے سو کا سو ہی ہوگا' زنگ لگ جائے تو اور بات ہے ورنہ ہوگا اتنے کا اتنا ہی۔ اس میں اس کی استطاعت نہیں ہے کہ وہ ایک سو ایک ہو جائے لیکن اسی کو اٹھا کر جب آپ کسی دوسرے شخص کو دیدیتے ہیں' اس کے بعد' سال کے بعد' وہ ایک سو دس' ایک سو بیس' ایک سو تیس' ایک سو پچاس' ہوتا چلا جاتا ہے' جس میں خود پیدا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ ہمارا غلط نظام اس میں یہ صلاحیت دیدیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ پیدا کر کے لائے۔ Capital (سرمائے) کے اوپر اس قسم کی جو بڑھوتی یا زیادتی ہے' وہ کسی شکل کے اندر بھی ہو' وہ ربٰو ہے۔

یہودیوں کے ہاں ربٰو کی Definition (تعریف) ہمارے ہاں کے سود کی سی ہے

یہودیوں کو اس سے منع کیا گیا تھا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (4:161) اس سے روکا گیا تھا۔ آپ کو پتہ ہے انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اس ربٰو کی اپنے ہاں Definition (تعریف) خود کرنی شروع کر دی بعینہٖ جو آپ نے ربٰو کی جگہ سود کا لفظ رکھا ہے۔ اب آگے سود کے متعلق بحثیں چلیں۔ آپ کو پتہ ہے بڑے زور و شور سے بحثیں چلتی ہیں کہ Commercial Interest (تجارتی سود) جائز ہے یا نہیں' یہ زرعی انٹرسٹ' کمرشل انٹرسٹ' بینک کا انٹرسٹ' انشورنس پہ انٹرسٹ' یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ اربابِ شریعت دوسری طرف بڑھے' انہوں نے کہا کہ صاحب! ٹھیک ہے' سود حرام ہے یہ مضاربت حلال ہے۔ کوئی شخص کاروبار کرتا ہے' آپ نے اس کو اپنے دو ہزار روپے دیدیئے اب وہ اس سے محنت کر رہا ہے' کام کاج کر رہا ہے' جو نفع آ رہا ہے اس نفع میں آپ کو دو ہزار کے اعتبار سے دیئے چلا جا رہا ہے' یہ حلال ہے۔ ارے! کیا یہ ربٰو نہیں ہے؟ کہ جی نہیں' کیا ہے جی؟ کہنے لگے جی! یہ تو مضاربت ہے۔

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے برعکس ربوٰ کا نظام:

غریب کسان آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا صاحب! یہ زمین کا ایک ٹکڑا ملتا ہے' مجھے آپ کسی طرح سے پانچ سو روپیہ دیدیں' میں یہ لے لوں' محنت کروں گا' اس میں فصل آئے گی' بال بچوں کا پیٹ پالوں گا آپ کا پانچ سو بھی ادا کردوں گا۔ اب اگر آپ اس سے کہتے ہیں کہ صاحب! پانچ سو کا پانچ سو کیوں' دس روپے سال کے بعد اس پہ دوں گا' پچاس روپے اس کے اوپر اور دوں گا۔ وہ کہے گا لاحول ولاقوۃ لوگ کیا کہیں گے کہ ''آ بیاج کھاندا اے جی اے'' (یہ سود کھاتا ہے جی)۔ سود حرام ہے۔ اس نے کہا کہ میاں! کہاں سردردی کرتے پھرو گے' کچہریوں میں جاؤ گے' رجسٹریاں کراؤ گے' پتہ نہیں کوئی دھوکا کرلے۔ کوئی بات نہیں! یہ زمین میں لے لیتا ہوں' تم جاؤ اس پہ کھیتی باڑی کرو' جو کچھ فصل پیدا ہوگی آدھی تمہاری' آدھی میری۔ یعنی یہ کوئی ربوٰ نہیں ہے۔ دس فیصد ربوٰ مگر یہ آدھی فصل لے آنا' کہنے لگے کہ یہ مزارعت ہے۔

دین کی جگہ مذہب نے ہمیشہ ہر سطح پر کٹ حجتی سے کام لیا ہے

یہ اُس زمانے کی بحثیں تھیں' جب یہ بنک اور انشورنس نہیں تھے' یہ ہمارے دور کی ہیں' ہم نے اس میں ایک یہ کمرشل انٹرسٹ لگایا' اس کو Sleeping Partnership (غیر کارگزار شریک) کہہ دیا۔ سوچیے تو سہی۔ انہوں (یہودیوں) نے بھی یہ کچھ کیا تھا۔ جہاں بھی دین مذہب میں آتا ہے اور یہ جو مذہبی پریسٹ ہڈ ہے' وہ اس کی اجارہ دار بنتی ہے تو وہ یہ سب کچھ کرتی ہے۔ یہ سارے آپ کے قوانین' یہ فقہیں' اس کی تشریحات آپ کے دور ملوکیت میں ہوئی۔ وہی آپ کے ہاں جاگیرداری کا' فیوڈل ازم کا دور' سرمایہ داری کا دور بنا۔ ان کے ہاں شریعت میں انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں صاحب! ربوٰ ہی حرام ہے' مضاربت تو حرام نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ یہ تھے وہ جرائم جس کی وجہ سے اس قوم کی یہ حالت ہوئی تھی۔ کہا ہے کہ وَاَكْلِهِمُ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (4:161) یہ بغیر کسی تعمیری کام یا کام میں حصہ لیے لوگوں کا مال کھا جانا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ یہ کرتے کیا ہیں؟ صبح کی نماز پڑھائی صاحب! نماز پڑھانے کے بعد پھر مہینے کے بعد کہتے ہیں کہ ''سٹو پیسے میرے' اوکا ہدے پیسے؟ نماز پڑھائی سی جی' اوتوں آپ نماز نئیں سی پڑھنی؟'' (پیسے ادا کرو میرے۔ ارے بھئی! کس چیز کے پیسے؟ جی! میں نے نماز پڑھائی تھی۔ ارے کیا تُو نے خود نماز نہیں پڑھنی تھی؟)

نماز پڑھانے کا معاوضہ:

عزیزانِ من! سوچئے یہ جو امامت کی تنخواہ ہے' وہ کس چیز کی ہوتی ہے؟ یہ ہے نماز پڑھانے کی۔ یعنی یہ کہ مسجد میں اور کسی کے لیے جگہ نہ ہو' لوگوں کو دھکے پڑ رہے ہوں' باہر سڑک پہ بارش میں دھوپ میں کھڑے ہوں' ان حضرت صاحب کے لیے سب سے آگے جگہ ہے' ان صاحب کے لیے ایک مقام متعین کیا جاتا ہے۔ یہ سب سے آخر میں آئیں سب سے آگے ان کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ وہ نماز جو انہوں نے پڑھنی تھی' جو ان کے اوپر فریضہ تھا' اس نماز کی ادائیگی کے لیے اتنی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ وہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ''سٹ پیسے۔ او کسے نیں او ہنوں کہیا سی نا او گرمی دے موسم اچ

دھپے کھلوتا ہو یا ہیگا ایں چھاویں ہوجا' کہن لگا کی دیں گا'' (رقم ادا کرو۔ کسی نے اسے کہا تھا کہ گرمی کے موسم میں دھوپ میں کھڑے ہو' ذرا سائے میں آ جاؤ تو وہ کہنے لگا کہ کیا دو گے)۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ: وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (4:161)۔ عزیزانِ من! یہ باطل کا لفظ دیکھیے قرآنِ کریم میں اور لغتِ عرب میں کہ کہاں استعمال ہوتا ہے: ''بغیر تعمیری نتیجہ پیدا کیے ہوئے کوئی مال کھا جانا''۔ پریسٹ ہڈ تو ہوتی ہی یہ ہے صاحب! کوئی تعمیری کام کرتی ہی نہیں' کھائے چلے جا رہے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ یوں کرتے تھے' ایسے کرتے تھے۔ کہا کہ ہم بھی کچھ کرتے تھے۔ ہم کیا کر رہے تھے؟ کہا ہے کہ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (4:161) ان کے لیے دردانگیز عذاب ہے۔

ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں ذلیل ترین شکست

اب تو یہودیوں کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔ عزیزانِ من! وہ تو ایسا دردانگیز عذاب آپ پر مسلط کر رہے ہیں کہ آپ ساٹھ ستر کروڑ کی چیخیں نکل رہی ہیں' اور عذاب ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے جنہیں آپ ہزار برس سے ذلیل ترین قوم کہہ رہے تھے' اس قوم کے ہاتھوں سے ذلت کی انتہا یہ ہے۔ خواجہ حافظ [1] کے مفہوم میں ''کسی کا غلام و نوکر بننا ہے تو اس کا تو بن جس کی دنیا میں کچھ آن ہو۔ وہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے' وہ لاہور کا وہ پہلوان' وہ شاگرد چلا تھا پہلی کشتی لڑنے کے لیے' تو اسے اس نے کہا تھا کہ بیٹا! ایک دعا مانگنا' پہلی کشتی لڑنے جا رہے ہو'' کہن لگا جی! کی دعا منگاں' او دعا اے منگ کہ یا اللہ! اگر میں ڈٹھنا ہیگا اے تے کسے ایسے کولوں جنے پہلے وی کسے نوں ڈھایا ہووے'' (کہنے لگا جی! کیا دعا مانگوں؟ (کہا کہ) وہ یہ دعا مانگ کہ اے اللہ اگر میں نے ڈھے جانا ہے تو مجھے ایسے آدمی سے نیچا دکھانا جس نے پہلے بھی لوگوں کو نیچے دکھایا ہو)۔ یہ وہ قوم ہے جسے آپ خود ہزار برس سے ذلیل وخوار کہتے چلے آ رہے ہیں۔ جونہی آپ نے سورۃ الفاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (1:7) کہا اور آپ کے ہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ مغضوب علیہ یہودی ہیں۔ اس قسم کی ذلیل وخوار قوم کے ہاتھوں سے جوتے پڑ رہے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (4:161) اس سے زیادہ دردانگیز عذاب اور کونسا ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تھے ان کے جرائم جو قرآنِ حکیم نے گنائے تھے:

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہم ہیں کہ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (7:45) انسانیت کو خدا تک پہنچنے کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئے ہیں' ہم نہ ہوتے تو یہ انسانیت واقعی خدا کے راستے کے اوپر آ گئی ہوتی۔ ہم نے یہ ربوٰ کے نظام رائج کیے ہوئے ہیں اور یہ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (4:161) کے بھی۔ عذاب الیم کے اندر ہم گرفتار ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ النساء کی آیت 161 تک ہی ہم آئے' آئندہ ہم 162 ویں آیت سے لیں گے۔

---

[1] مسلمانوں میں خواجہ حافظ شیرازی کو ایک شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا' انہیں بہت بڑا صوفی' ولی اللہ اور مقربِ بارگاہِ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ اب تو اس کا اتنا چرچا نہیں رہا لیکن جس زمانے میں علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرار خودی شائع ہوئی تھی' دیوانِ حافظ سے لوگ فال لیتے تھے اور یہ فال انتہائی احترام اور عقیدت کے ساتھ نکالی جاتی تھی (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص:291)

آصف جلیل، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ اور موجودہ سکالرز

خلفاء راشدین کے دور کے بعد ملوکیت کا دور شروع ہوا تو آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نظام کی جگہ انسانی طرز حکومت نے جگہ لینا شروع کر دیا۔ اسے اسلامی مملکت ہی سمجھا جاتا رہا۔ دوسری صدی میں نبی کریم ﷺ سے منسوب روایات کو بہت زیادہ اہمیت ملنا شروع ہوگئی اور لوگوں نے بغیر سوچے سمجھے انہیں قبول کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ بہت سی روایات کو اگر قرآن کریم کی روشنی میں پرکھا جاتا تو اسی وقت انہیں رد کیا جا سکتا تھا لیکن ان روایات سے حکمران طبقے کو یہ آسانی ہوگئی کہ لوگ مذہبی رسومات ادا کرنے میں مصروف رہے اور ان کی توجہ امور مملکت سے دور رہی۔ اسی دوران یہ عقیدہ بھی ذہن نشین کرایا گیا کہ انسان کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہے جس سے مفر نہیں ہے۔ غربت امارت، صحت بیماری، زندگی موت وغیرہ سب کچھ پیدائش کے ساتھ ہی طے کر دیا جاتا ہے۔ تیسری صدی کے آغاز تک اسلام محض رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ مذہبی پیشوائیت نے اسلام سمجھانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ قرآن کریم محض ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا اور قرآنی نظام مملکت کا تصور مٹ کر رہ گیا۔ تیرہ سو سال تک یہی اسلام رائج رہا۔ اس دوران اگر کسی نے قرآن خالص کی بات کی ہوگی تو اس کا سراغ نہیں ملتا جس کا غالب امکان یہی نظر آتا ہے کہ ایسا کہنے والے کو راستے سے ہٹا دیا گیا ہوگا اور اس کی تحریر ضائع کر دی گئی ہوگی۔ اس گمان کا سبب یہ ہے کہ ایک صدی پہلے لکھی گئی مصری عالم کی ایک کتاب سامنے آئی جس میں قرآن کی تفسیر قرآن سے کی گئی تھی اور جسے مذہبی پیشوائیت نے خلاف اسلام قرار دے دیا اور ان کے کہنے پر حکومت نے نہ صرف اس پر پابندی لگا دی بلکہ اس کے تمام نسخے ضبط کر لئے گئے۔ اگر اتفاقاً یا قصداً اس کا ایک نسخہ محفوظ نہ رہ گیا ہوتا تو کبھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ کبھی کسی نے روایات سے پاک قرآنی نظام کی بات بھی کی تھی۔

پچھلی صدی کے آغاز میں سرسید احمد خان، علامہ مشرقی اور علامہ اقبال نے قرآن کریم کو قرآن ہی سے سمجھنے پر زور دیا لیکن علامہ پرویزؒ اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال سے زائد کا عرصہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کی وضاحت تحریری اور تقریری شکل میں کرنے میں صرف کیا۔ عام انسانوں کے لئے قرآن کریم سمجھنا نہایت آسان بنانے کے لئے انہوں نے انتھک محنت سے لغات القرآن مرتب کی جس میں تمام قرآنی الفاظ کے معانی عربوں کی مختلف لغتوں سے اخذ کر کے دے دیئے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جب ابھی کمپیوٹر کا نام بھی نہیں سنا تھا، موضوعات کے لحاظ سے قرآنی آیات کے حوالہ جات اپنی کتاب تبویب القرآن میں یکجا کر کے طالب علموں کے لئے مزید آسانی کر دی۔ علاوہ ازیں ہر موضوع پر متعدد کتب کے علاوہ مفہوم القرآن بھی لکھا۔ اتنے بڑی علمی خزانے کی موجودگی میں کوئی شکایت نہیں کر سکتا

تھا کہ قرآن کریم سمجھنا بہت مشکل ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ لوگ قرآن کریم کو سمجھنے لگ جائیں کیونکہ اس سے ان کی اسلام پر اجارہ داری کا خاتمہ ہوسکتا تھا۔ اس لئے آپس میں دست وگریباں تمام مکاتب فکر نے مل کر علامہ پرویزؒ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ ان کا نام لینا بھی مشکل بنا دیا۔ اگر کوئی ان کی کتابوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے بدگماں کر دیا جاتا۔ ان کے خلاف جھوٹے الزامات لگائے گئے، ان سے وہ باتیں منسوب کی گئیں جو انہوں نے نہیں کہی، سیاق وسباق سے ہٹ کر ان کی تحریروں کے حوالے دیئے جاتے۔ اس طرح کے نامساعد حالات میں ان کا قلم مسلسل چلتا رہا، ان کی تحریریں منظر عام پر آتی رہیں، ان کا ہفتہ وار درس چلتا رہا۔ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ کسی ستائش کے متمنی ہیں یا شہرت کے خواہش مند۔ ان کا مشن صرف یہی تھا کہ قرآن کریم کی آواز ہر سو پھیلتی رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس روشنی سے فیضیاب ہوسکیں۔

علامہ پرویزؒ کی وفات کے بعد ادارہ طلوع اسلام نے جس کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی، ان کے مشن کو یعنی قرآن کریم کے پیغام کو دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچانے کا کام جاری رکھا ہے۔ جب سوشل میڈیا تک عام لوگوں کی رسائی ہوگئی تو بہت سے لوگ منظر عام پر آنا شروع ہوگئے جنہوں نے معمولی سی تبدیلی کے ساتھ قرآن کریم کی تشریح کرنا شروع کر دی۔ اگرچہ انہوں نے فکری طور پر علامہ پرویزؒ سے استفادہ کیا ہوتا ہے لیکن تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ جیسے یہ ان کی اپنی کاوش ہے۔ یہ احتیاط کی جاتی کہ علامہ پرویزؒ کا نام نہ آسکے، بلکہ ایسا ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کی دلیلیں لاتے ہیں کہ ان کی فکر اب پرانی ہوگئی ہے، موجودہ زمانے کے اعتبار سے قرآن کریم کی تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔ یا یہ کہ لوگ علامہ پرویز کا نام نہیں سننا پسند کرتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خود کہا ہے کہ میری بات حرف آخر نہیں ہے، آپ نے میرا اتباع نہیں کرنا وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے خود غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے اور کبھی اپنے فہم کو حرف آخر قرار نہیں دیا۔ بعض مقامات پر علامہ پرویز نے یہ بھی کہا ہے کہ ابھی موجودہ سائنسی علم وہاں تک نہیں پہنچا جس سے فلاں آیت کو سمجھا جاسکے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن کریم نے حدود کا تعین کر دیا ہے جو غیر متبدل ہیں جن میں رہتے ہوئے زمانے کے مطابق قانون سازی کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ قانون سازی ایک فرد کا کام نہیں ہے، یہ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوگی جس میں تمام امور مشاورت سے طے ہوں گے۔ اب مذکورہ بالا قسم کے افراد نے جو بزعمِ خویش نئے زمانے کے مطابق تشریح کر رہے ہیں وہ اس طرح ہے کہ لغت سے قرآنی الفاظ کے وہ معانی لئے جائیں جو علامہ پرویزؒ سے مختلف ہوں لیکن وہ عربی گرائمر سے ناواقف ہوتے ہیں اور کچھ تو گرائمر کو ہی خلاف قرآن قرار دے دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے من پسند معانی کا جواز نکال سکیں۔ بعض افراد نے تفاسیر بھی لکھی ہیں لیکن زیادہ تر کو ویڈیو درس ریکارڈ کرا کر یوٹیوب پر ''وائرل'' کرنے کی خواہش ہے۔ بعض نام نہاد افراد قرآن کریم کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ کچھ علامہ پرویزؒ سے ملتی ہو اور ساتھ میں مذہبی رنگ کی آمیزش کر دی جائے تاکہ عوام الناس ناراض نہ ہو جائیں اور ان پر کوئی چھاپ نہ لگ جائے۔ علامہ پرویزؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے کچھ اصول بیان کئے ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے قرآن کے مقاصد پورے نہیں ہوسکتے۔ پہلا اصول یہ کہ کسی بھی لفظ کے وہ معنی لئے جائیں جو زمانہ نزول قرآن میں عرب لیا کرتے تھے، لیکن ساتھ میں یہ بھی وضاحت کر دی کہ یہ نہیں کہ اس میں سے جو جی میں آئے مطلب لے لیا جائے۔ انہوں نے کئی مرتبہ متنبہ کیا کہ ذہن میں آنے والے خیال کو

قرآن سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر لغت کا سہارا لینا صحیح نہیں ہے۔ اس کے لئے دوسرے اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور وہ ہے تصریف آیات یعنی کسی بھی موضوع پر قرآن میں مختلف مقامات جو آیات آئی ہیں انہیں یکجا کر کے دیکھا جائے کہ کہیں ہمارا لیا گیا مفہوم کسی دوسری آیت سے متصادم تو نہیں؟ ایسا کرنے سے تضاد پیدا ہوتا ہے اور قرآن کریم کی صداقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہی دلیل دی ہے کہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں تضاد نظر آتا۔ تیسرا اصول یہ بتایا کہ آپ کا لیا ہوا کوئی مفہوم قرآن کریم کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جاتا ہو۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے بارہا غور وفکر کرنے پر زور دیا ہے تو کوئی ایسا مطلب لینا صحیح نہیں ہوگا جو بغیر سوچے سمجھے مان لینے کا مشورہ دے یا غلامی کا جواز پیش کرے یا زبردستی منوانے پر زور دے وغیرہ۔

ایک اور بات جو موجودہ نام نہاد مفکرین کی اکثریت کی تشریحات سے سامنے آتی ہے وہ ہے کہ ان میں قرآن کریم کو بطور نظام مملکت پیش نہیں کیا جاتا اور نہ ہی یہ واضح کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا تجویز کردہ مفہوم لیا جائے تو اس سے عام انسان کو کیا فائدہ ہو گا؟۔ علاوہ ازیں ذات کی نشوونما اور مکافاتِ عمل کا ذکر مفقود ہوتا ہے۔ یہ دو باتیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں متعدد بار آیا ہے اور علامہ پرویزؒ نے ان مقامات پر نہایت تفصیل سے ان کی وضاحت کی ہے کیونکہ آخرت پر ایمان اسلام کا لازمی جزء ہے اور ہر شخص کو یقین ہونا چاہیے کہ ہر عمل کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے اور اگر کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے اسے مدنظر رکھا جائے تو غلط سمت میں قدم اٹھ ہی نہیں سکتا۔ اس عمل کا نتیجہ انسانی ذات پر بھی مرتب ہوتا رہتا ہے۔ ذات کی نشوونما کا تصور کسی اور دانشور نے نہیں دیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا جو کچھ موجودہ مفکر پیش کر رہے ہیں اس سے بہت سے لوگ قرآن کریم کی طرف آ رہے ہیں؟ ایسا کوئی امکان نظر نہیں آیا کیونکہ عام طور پر لوگ اسلام کو بطور مذہب مانتے ہیں اور اس بارے میں غور وفکر نہیں کرتے اور اگر کچھ لوگ کسی ایک سے متفق بھی ہو جائیں تو اس نظری تائید کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ بعض افراد کو تحریک طلوع اسلام سے یہ شکایت ہے کہ یہ کچھ نہیں کر رہی۔ وضاحت طلب کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فلاحی کام نہیں ہو رہا، عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا جاتا وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے کہیں کہا ہے کہ نظام کی تبدیلی کے بغیر اسی باطل کے نظام میں رہ کر قرآن کے ایک حصہ پر عمل کر لو؟ اس طرزِ عمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

”لیکن تم ہو کہ باہمی خونریزیاں کرتے ہو اور اپنے غریب بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔ اور تم ان غریبوں کے خلاف ظلم واستبداد میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔ کہیں کمزوروں کو کمزور تر بنانے سے اور کہیں ان سرکشوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے،، اور جب ان گھروں سے نکالے ہوئے غریبوں کو دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں، تو تم ان کا زرِ فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا وہ سنگین جرم تھا جس سے تمہیں منع کیا گیا تھا۔ سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ تم میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کی جزا اس کے سوا کیا ہے کہ وہ دنیا میں ذلیل وخوار رہیں اور آخرت میں انہیں شدید عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔“ (2:85)

اس طرح کے پروگراموں سے نظامِ مملکت کی تبدیلی سے توجہ ہٹ کر دوسری طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے کام تو مذہبی تنظیمیں نہایت وسیع پیمانے پر کر رہی ہیں اور سرمایہ داروں کی طرف سے انہیں اربوں روپے ملتے ہیں۔ کیا ایسا کرنے سے غربت کم ہو رہی ہے یا غریبوں کی تعداد کم ہو رہی ہے؟ کیا یہ قرآن کریم کا تجویز کردہ رزق کریم ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری مملکت پر عائد کی ہے یا کچھ افراد اور تنظیموں پر؟ کیا اس طرح کرنے سے اسلامی مملکت کے قیام میں مدد ملتی ہے یا اس سے باطل نظام مزید مضبوط ہوتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے قرآن کریم کو سمجھنا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ یقین بھی ہونا چاہیے کہ ایسا ممکن ہے اور اس کے لئے انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پیشِ نظر رہنی چاہئے۔ اس نظام کے قیام کے لئے وہی طریقہ کار مفید اور کامیاب ہوگا جو قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔ اگر ہر فرد یا گروہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ ان کا تجویز کردہ پروگرام ہی واحد حل ہے تو اجتماعیت ممکن نہیں ہو سکے گی نہ ایک مرکز پر جمع ہو سکیں گے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مشاورت کرنے کا کہا ہے جن سے اختلافات دور کئے جا سکتے ہیں۔ ایک سے زیادہ مراکز سے امت واحدہ تشکیل نہیں پا سکتی جو قرآنی نظام کے قیام کے لئے لازمی شرط ہے۔ اس وقت دنیا میں طلوعِ اسلام ہی وہ واحد ادارہ ہے جو قرآنی نظامِ مملکت کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ متحد ہونے کے لئے الگ الگ تنظیموں سے فائدے کی بجائے نقصان ہو رہا ہے۔ جو لوگ تحریک طلوعِ اسلام کو ناکام قرار دیتے ہیں وہی اس کو کمزور کرنے میں بالواسطہ اپنا حصہ ڈال رہے ہوتے ہیں۔ علامہ پرویزؒ نے تحریک پر اٹھنے والے تمام اعتراضات کا جواب مختلف مواقع پر اپنے خطابات اور تحریروں میں نہایت تفصیل سے دے رکھا ہے۔ لیکن اس کا اگر یہ حل نکالا جائے کہ مختلف افراد اور گروہ اپنے طریقہ کار کے مطابق کام کرنا شروع کر دیں تو یہ قرآنی نظام کے قیام کی راہ میں روکاوٹیں بنیں گے اور موجودہ باطل نظام سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکے گا۔ افراد جو کام کرتے ہیں وہ ان کی زندگی تک محدود رہتا ہے اس کے بعد لوگ انہیں بھول جاتے ہیں لیکن ادارہ قائم ہے اور رہے گا۔ اگر سنجیدگی سے مل کر سب سے بنیادی کام یعنی لوگوں کی فکری تبدیلی پر توجہ دی جائے تو نظام کی تبدیلی کا عمل تیز ہو جائے گا ورنہ جہاں چودہ سو سال گزر گئے ہیں مزید ہزاروں سال لگ جائیں گے لیکن اس کے لئے طریقہ کار صرف وہی نتیجہ خیز ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے تجویز کر رکھا ہے اور وہ ہے تغیرِ نفس۔ جب تک لوگ دل کے اطمینان کے ساتھ قرآن کریم کو سمجھ کر قبول نہیں کریں گے اور اس پر یقین کامل کے ساتھ نہیں جڑے رہیں گے، نظام کی تبدیلی کا جذبہ شدت سے نہیں ابھرے گا جو قرآن کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا باعث بنے۔ اسی طرح ایک کارواں بنتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کو نظر انداز کرنے سے یہ ناممکن ہے کہ کوئی نتیجہ نکل سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اختیار و ارادہ دے رکھا ہے اور کسی دوسرے شخص کو اپنی مرضی مسلط کرنے کی اجازت نہیں دی۔

قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جو کچھ میں نے اپنے استادِ محترم علامہ پرویزؒ سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کا نقطۂ ماسکہ باطل نظام کی جگہ دینِ الٰہی کا قیام ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کے لئے متعدد گروہ یا تنظیمیں میدان میں اتری ہوئی ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس طرح ہم منزل سے دور ہو رہے ہیں۔ اس کے لئے اپنے تصور کی بجائے قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریقہ کار پر عمل کرنا ہوگا۔ امید کرتا ہوں کہ قرآن کریم سے جڑے ہوئے افراد اس پہلو پر غور کریں گے۔

نفیسہ فریاد چاہل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''عورت قرآن کے آئینے میں''
پر ایک طالب علم بیٹی کا تبصرہ

پمفلٹ کے سرورق پر دل کو چھو لینے والا ایک جملہ درج ہے کہ ''کسی حیوان نے بھی اپنی ہم جنس کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے عورت کے ساتھ کیا ہے''۔

ادارہ طلوعِ اسلام نے قرآن کے نور کو عام کرنے کا ذمہ اٹھایا ہے۔ ہر بار ایسی کہانیاں کھول کھول کر ہمارے سامنے لاتا ہے، جس سے ہمارا چھوٹا ذہن دنگ رہ جائے کہ دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں تاریکی وظلمات کی وجہ سے عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی مخلوق مانا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقل وخرد کے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز کہانی ہے۔ کہانی کاروں کے ہاتھ میں قلم آیا تو انہوں نے جو ذہن میں آیا لکھ دیا۔ اور انسان جس کو قرآنی آیات پر بھی گونگے بہرے بن کر گرنے کا حکم نہیں تھا۔ وہی انسان انسانوں کی لکھی تحاریر پر اندھا، بہرہ، گونگا بن کر یقین وعمل کر گیا۔

میرے حصے میں دوسری بار بھی اس موضوع پر قلم اٹھانا آیا ہے۔ جس پر لکھنا مجھے ہمیشہ سے ہی مشکل لگتا رہا ہے۔ لیکن اب ہمارا مقدر دوسری بار بھی یہ ہی ٹھہرایا گیا تو ہم پر لازم تھا کہ ہم تحقیق کرتے اور ان عورتوں کے حالات جانتے جن کو محظ قرآن سے دوری کی وجہ سے مظالم کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت کے زیرِ اثر جو فرمودات ہمارے معاشرے میں پھیلائے گئے ہیں کہ عورت ٹیڑھی پسلی کی پیداوار ہے یا عورت میں روح نہیں ہوتی اور تو اور یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآنی احکام صرف مردوں کے لیے نازل ہوئے ہیں۔ عورت قرآن کی مخاطب بھی نہیں سمجھی جاتی۔ اس حوالے سے جو روایات پیش کی جاتی ہیں ان کو قرآن کی ایک ضرب ہی کافی تھی مگر افسوس کہ ہم نے اپنے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آئے پیغامات کو سمجھنا ضروری ہی نہیں سمجھا۔ اس حوالے سے علامہ اقبال رحمۃ اللہ کا بیان جو کہ علامہ غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ نے ''طاہرہ کے نام خطوط'' میں رقم کیا ہے۔ یہاں درج کرتی چلوں۔

''وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور قرآن کا ویسے ہی مطالعہ کرتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ یہ کتاب کسی عورت کی تصنیف ہے جس نے مرد سے اپنی صنف کے غصب کردہ حقوق کا بدلہ لیا ہے''۔

شادی شدہ عورت پر جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس پر تو فقط یہ ہی کہیں گے کہ وہ لوگ بیگانے ہوتے ہیں اس لیے ایسا کرتے ہیں مگر جو سلوک اکثر گھرانوں میں اپنی سگی بیٹی کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ لکھنے سے پہلے ہی ہماری روح کانپ جائے۔ ہم نے اس معاملے پر خوب غور کیا اور جانا کہ کچھ مشاہدات ہماری اپنی ملکیت ہوتے ہیں اور کچھ دوسروں کی آنکھ نے کیے ہوتے ہیں۔ ہمیں بہر حال سچائیوں کو تلاشنا ہے پھر یہ ضروری نہیں کہ یہ سچائیاں ہم نے حاصل کی ہیں یا دوسروں نے۔ اب اگر مری میں برفباری کے دنوں میں ہم وہاں پر موجود نہیں تھے اور ہم نے خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو یہ زیادتی ہے کہ ہم اس شخص کی بات بھی نہ مانیں جو اس وقت وہاں پر موجود تھا اور ہمیں کتھا سنائی جا رہی ہے کہ وہاں برفباری ہوتی رہی ہے۔ سو اسی بات کو ہم نے دوسروں کے تجربات اور آپ بیتیوں کو مدنظر رکھ کر لکھنا شروع کیا ہے۔ اسی قسم کی تعلیمات کے حامل گھرانے کی لڑکی ہماری دوست تھی تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ابو کو بھائیوں نے کہا کہ ابو جی گھر میں سوئمنگ پول بنوانا ہے تو انہوں نے کہا میرے بیٹے جو کہیں گے وہی ہوگا کیونکہ انہوں نے تو یہیں رہنا ہے ہمارے پاس۔ کہنے لگی جب میں نے گھر میں تھوڑی سی تبدیلی کی بات کی تو وہ غصے میں آ گئے اور کہا کہ تم نے کون سا یہاں رہنا ہے جو ہم تمہاری بات مانیں۔ اندازہ لگائیں کہ کس طرح گھر کے تمام افراد کی موجودگی میں ایک بیٹی کی توہین کی گئی۔ یعنی اسے وہاں فرمائشیں کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔

ہم نے جانا کہ عورت کی جو تصویر مذہب نے پیش کی ہے اور اس کی دیکھا دیکھی اندھی تقلید میں لاعلموں کی جانب سے جو جو الزامات اس بیچاری پر لگائے گئے ہیں۔ قرآن کی نظر میں وہ بالکل شفاف ہے۔ قرآن کا مخاطب انسان ہے اور انسان سے مراد مرد و عورت دونوں ہیں۔ اگر مرد متقی ہو سکتا ہے تو عورت بھی قرآنی احکامات پر عمل کر کے متقی ہو سکتی ہے۔ اگر مرد کے لیے جزائے خیر ہے تو عورت کے لیے بھی ہے۔ ان لوگوں سے کہ جو عورتوں کو احکامِ الٰہی کے حصے دار نہیں سمجھتے سے ہمارا ایک معصومانہ سوال ہے کہ اللہ نے صلوٰۃ کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر آپ کے گھر کی عورت ایسا نہ کرے تو اس پر زور زبردستی کیوں؟ اگر باقی کے احکام آپ کے نظریے سے آپ کے لیے ہیں تو یہ حکم بھی فقط آپ کو ہی مبارک ہو۔ ہم یہاں صرف ان عبادات کا تذکرہ کریں گے جس کو ان لوگوں کی جانب سے خاص عبادات قرار دیا جاتا ہے۔ حج کا حکم ہوا تو کیوں عورتیں بھی حج کرنے پہنچ گئیں؟ آپ کی تعلیمات کی رو سے یہ حکم صرف مردوں کے لیے ہی خاص ہونا چاہیے تھا۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند کیوں عورتیں بھی ہیں؟ کیوں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عورتیں اپنے نام کی قربانیاں کرتی ہیں۔ صدقہ و خیرات کے عمل میں گھر کی عورتیں کیوں سرِ فہرست ہیں؟ آپ کے حساب سے جنت احکامِ خدا ماننے سے آپ کی ہو سکتی ہے تو نہ ماننے سے آپ سے چھن بھی سکتی ہے۔ اگر جنت عورت کی نہیں ہے تو جہنم بھی آپ کی ہی ہوئی۔ اگر آپ کے مطابق جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے اور آپ کے مطابق قرآن آپ کا، اسلام آپ کا، احادیث آپ کی، دنیا و آخرت بھی آپ کی، تو ان عبادات سے عورتوں کو روک دیجیے۔ اگر عورتوں کی تعداد جنت میں بہت کم ہوگی تو کیوں آپ ہی نے جنت اس کے قدموں کے نیچے رکھ دی؟ جواب

یہ ہے کہ اپنے فوائد اور اپنی مرضی سے جہل کی بنا پر جو جنگ اس صنف کے خلاف شروع کی گئی تھی یہ اسی صورت میں جاری و ساری رہ سکتی تھی جب آپ اسے بھی تعلیم و تربیت سے محروم رکھتے اور آپ خود بھی محروم رہتے۔ یہ فقط ایسے ہی تھمے گی جب آپ معاشرے میں عدل و مساوات کو لاگو کریں گے۔ آپ ہر قسم کے معاملات میں عورتوں کے تجربات کو ملحوظِ خاطر رکھیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا نے اس کو کتنا خوبصورت بنایا ہے۔ آپ اسے اپنے گھر کا آدھا حصے دار بنا کر دیکھیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ کیسے اپنے آنسوؤں اور غموں کو ایک طرف رکھ کر آپ کے گھر کو جنت بنا دے گی۔ مگر افسوس ہے کہ آپ کے خطبات و ارشادات نے اسے ذہنی مریضہ ہی بنایا ہے۔ وہ اس پھول کی مانند ہوگئی ہے جس سے تتلی رس چوس لیتی ہے جس کی وجہ سے اس کی ہیئت تو نہیں بدلتی مگر رنگ کھو دیتی ہے وہ دوسرے پھولوں کی بنسبت اپنی پہچان سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا قتل ایسے چھرے سے کیا گیا ہے جس پر اس کا خون بھی نظر نہ آئے۔

عین ممکن ہے کہ ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ہماری پہلی نسل کی عورتوں کو تعلیم و تربیت سے اس لیے دور رکھا گیا کہ انہوں نے پڑھ لکھ کر کونسا نوکریاں کرنی ہیں؟ مزید افسوس تب ہوا جب یہ سننے کو ملا کہ کچھ گھرانوں میں بیٹیوں کو ناظرہ قرآن پڑھانے کا رواج بھی نہ تھا۔ مرد تو مرد عورتیں بھی اس احساسِ کمتری کا شکار ہیں کہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کردہ ہیں لہذا اس کی زندگی میں جتنی بھی تبدیلیاں آئی ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ پیدائشی اعتبار سے ایسی ہی ہے۔

پمفلٹ میں سورہ احزاب کی آیت نمبر: 35 نقل کی گئی ہے۔ یہ آیت مجھے ایک عرصے سے بڑی خوبصورت لگتی رہی ہے۔ کیونکہ اس میں مجھے میرے لیے اللہ کا پیغام ملتا ہے اور قرآن اور اس کے نازل کرنے والے کے نزدیک اپنی اہمیت مزید واضح ہوتی دکھائی دیتی رہی ہے۔ جس میں دس دس خوبیاں دونوں کی مرد کی بھی اور عورت کی بھی بیان کی گئی ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کی طرف سے عورتوں کو کمتر گردانے کے لیے سورت توبہ کی آیت نمبر 71 پیش کی جاتی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (9:71)

آیت میں دلچسپی سے فکر کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ مردوں کا ایک درجہ زیادہ کیوں ہے؟ کیونکہ عورت کو عدت پورا کرنی ہوتی ہے اس کے بعد وہ نکاح ثانی کر سکتی ہے اور مرد کے لیے عدت کی شرط نہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر کوئی بھی علم رکھنے والا شخص اعتراض نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ آیت کا مفہوم واضح ہے۔

اس سے آگے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وراثت میں لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کا آدھا حصہ ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جواب بھی درج ہے کہ مرد کے کندھوں پر افرادِ خانہ کی کفالت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس وجہ سے اس کا حصہ دوگنا ہوتا ہے جب کہ عورت کے ذمے ایسا کچھ نہیں ہے اس لیے اس کا حصہ آدھا ہے۔ آپ غور کریں کہ عورت پھر بھی باپ کے ترکے میں حصہ دار ہے جبکہ وہ اپنے خاندان کی کفالت کی ذمہ دار بھی نہیں ہے۔ اللہ نے

عورت کو کتنی اہمیت دی ہے۔ دوسرا جواز یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ شہادت کے لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ یعنی مرد دو گواہ ہوں گے اور اگر ایک مرد ہو تو اس کے ساتھ دو عورتیں ہوں گی۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (2:282)

اس کا جواب علامہ پرویز صاحب کی رقم کردہ تحاریر اور قرآن کے مفہوم کی روشنی میں درج کیا گیا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ کیونکہ اکثر گھروں میں رہنے والی خواتین جب اس طرح کے مجمعوں میں جاتی ہیں تو وہ گھبرا جاتی ہیں۔ اس لیے اگر دو عورتیں ہوں گی تو ان کی ہمت بندھی رہے گی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حق بات کہہ سکیں گی۔ مگر عورت کو پھر حقیر سمجھنے کے لیے جو جواز پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرد دو عورتوں کے برابر ہے۔ علامہ صاحب نے جواب دیا ہے ان لوگوں کو کہ اگر دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے اور دو عورتیں ہی گواہی دے سکتی ہیں تو پھر دو مردوں کی گواہی کیوں؟ مرد بھی ایک ہی گواہی دے۔ دو آدمیوں کی ضرورت بھی اس لیے ہے کہ اگر ایک بندہ بھول جائے تو دوسرا اسے یاد کروا دے۔ اور اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد کروا دے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۳۲ (4:32)

''جو مردوں نے کمایا وہ ان کے لیے اور جو عورتوں نے کمایا وہ ان کے لیے۔''

یعنی جتنی محنت جس نے بھی کی وہ اس کی کمائی ہے۔ لہٰذا اس کی کمائی پر اس کا پورا پورا حق ہے۔ اسلام کا حسن یہ ہے کہ مرد و عورت اپنی اپنی کمائی ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ اگر عورت پیسہ نہیں بناتی تو وہ دن بھر اپنے گھر والوں کی خدمت کرتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی ارننگ ہے۔ جبکہ مرد کی کمائی سکوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ عورت کی گھر میں حسن کی صورت۔ اگر اتنا ہی کام عورت پیسہ کمانے کے لیے کرے تو وہ مرد کے مقابلے میں برابر کام کرتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا کام اس سے زیادہ ہی ہو۔

پردہ کے متعلق پمفلٹ میں درج موضوع سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ سورہ احزاب اور سورہ النساء کی پردہ کے متعلق آیات سب سے پہلی آیات تھیں جو میں نے پردے کے متعلق پڑھی تھیں اور ان دنوں یہ حرفِ آخر لگتا تھا کہ عورت کو پردہ کرنا ہے تو کرنا ہے۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ اس کی اہمیت کیا ہے اور نہ کرنے کے نقصان کیا ہیں؟ پمفلٹ میں درج پردہ کے متعلق جو موضوع ہے اسے ہم اپنے تجربات کی روشنی میں مزید واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو تین واقعات درج کرتی چلوں۔ ایک بار ایک خاتون امی جان کے پاس آئیں اور انہیں بتانے لگیں کہ میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ شہر گئی۔ رکشے کی پچھلی تینوں سیٹوں پر ہم بیٹھی تھیں۔ اسی اثناء موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکے ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ ایک لڑکے نے

موبائل نکالا اور میری بیٹیوں کی وڈیو بنانے لگا۔ کہتی ہیں میں نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ اپنے چہرے ڈھانپ لو۔ انہوں نے اپنے دوپٹوں سے اپنے چہرے ڈھانپے اور تبھی وہ لڑکے بھی کہیں غائب ہو گئے۔ ایک بار ایک لڑکی نے اپنی کسی جاننے والی لڑکی کا واقعہ سنایا کہ یونیورسٹی کے زمانے میں اس نے اپنی دوستوں کے ساتھ گروپ فوٹوز بنوالیں۔ ان میں سے ہی کسی لڑکی نے وہ تصاویر سوشل میڈیا پر لگا دیں۔ اس لڑکی کو کیا خبر کہ اس کی تصویر کہاں کہاں گئی۔ اس لڑکی کی شادی ہونے کے بعد ایک دن اس کے شوہر نے اپنے موبائل سے وہی تصویر جو اس نے یونیورسٹی میں بنوائی تھی اسے دکھائی اور پوچھا کہ یہ تم ہو۔ کہنے لگی ہاں میں ہی ہوں مگر آپ کو کہاں سے ملی۔ بس لڑکی کے اقرار کی دیر تھی۔ شوہر نے کہا اپنا بوریا بستر باندھو اور نکلو یہاں سے یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ہم جانتے ہیں یہ دونوں واقعات مردوں کی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ اگر ان کی تربیت اچھے ماحول میں کی گئی ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ مگر یہاں صرف مرد ہی قصوروار نہیں جب عورت کو جلباب کا حکم دیا گیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو ڈھانپ کر رکھے۔ تاکہ ایسے حادثات سے پیشگی بچا جا سکے۔ ایک بار قریب منعقدہ فیئر میں بھائی جان ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں جانے سے پہلے ہمیں تو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کس قسم کا ماحول ہوگا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک حضرت موبائل تھامے پورے ایریے کے ویڈیو بناتے نظر آئے۔ تھوڑا سا اور آگے گئے تو دو چار موبائل اور اپنے مالکوں سمیت سارے نظارے کو فوکس کیے ہوئے ملے۔ مختصراً یہ کہ سارا مجمع کیمروں کی آنکھ میں سیو ہو رہا تھا۔ ہم نے بھائی جان کا بازو پکڑا اور کہا گھر چلیں دوبارہ زندگی رہی تو اس طرح کی گیدرنگ میں ہم تو کبھی بھی نہ آئیں گے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے نا کہ اپنے ''گھروں میں ٹھہری رہو'' یہ اسی طرح کے ایونٹس میں جانے کی روک تھام کے لیے ہے۔ اگر زمانہ جاہلیت میں پردے کی آیات اس لیے نازل ہوئی تھیں کہ تب لوگ بد دماغ تھے تو زمانۂ حاضر میں یہ کمی کیمروں اور سوشل ایپس نے پوری کر دی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے ''طاہرہ کے نام خطوط'' میں ''علامہ غلام احمد پرویز'' کا کھینچا گیا خاکہ مدنظر رکھنا ہوگا۔ جہاں وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے آج تک اس کا ماتھا تک کھلا نہیں دیکھا۔ بات کرتی ہے تو نگاہیں زمین میں گڑی ہوتی ہیں۔ اور تو اور کبھی میرے سامنے سے بھی گزرنا پڑے تو اس طرح سمٹی سمٹائی ہوئی چلتی ہے کہ بس چلے تو زمین میں ہی دھنس جائے۔''

قارئین کرام! یہ اس دور کی بات ہے جب سادہ کیمرے بھی اکا دکا ہی کسی کے پاس ہوا کرتے تھے۔ تب مردوں کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی ہوتی تھیں اور شریف گھرانوں کی عورتوں کی بھی۔ مگر اب اس کی گنجائش نہیں رہی کہ عورت اس طرح بے دھڑک گھر سے باہر نکل جائے۔ یہ حدود اللہ کی قائم کردہ ہیں اور اللہ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ آپ لاکھ کوشش کر لیں ایک وقت میں معاشرے کے تمام افراد قرآن والے نہیں ہو سکتے۔ جب تمام لوگ قرآن والے نہیں ہیں تو ان کو کسی کی پرائیویسی اور ذات کی کیا فکر ہوگی؟ وہ تو جو ذہن میں آئے گا کرے گا۔ بلی کے سامنے دودھ رکھیں گے تو وہ پیئے گی۔ بچت صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اپنے دودھ کو محفوظ جگہ پر رکھیں اور اگر مجبوری میں کہیں باہر رکھنا پڑ جائے تو اس کے ساتھ احتیاطی تدابیر اپنانا ضروری ہے۔

8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔

12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
05

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)



اُمتِ مسلمہ کا عالمگیر اجتماع